مسلمان اور سائنس

مصنفہ

عالیجناب خان بہادر
ابو عبداللہ محمد ذکاء اللہ خانصاحب ایم۔اے
ریٹائرڈ کلکٹر و مجسٹریٹ سول لائن بریلی
حال وارد۔ دتیا

تقریظ

ایک فاضلانہ مضمون "مسلمان اور سائنس" کے عنوان سے عالیجناب خان بہادر مولوی ابو عبداللہ محمد ذکا ء اللہ خانصاحب ایم اے (ریٹائرڈ کلکٹر و مجسٹریٹ) نے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع کیا ہے جس کی چار قسطیں علاوہ اخبارات و رسائل کے پمفلٹ کی صورت میں بھی چھپ کر ملک و اقوام کی نگاہ سے گذر چکی ہیں بہت ممکن تھا کہ پانچویں قسط بھی اسی طور سے شائع کر دی جاتی۔ لیکن مضمون کی اہمیت و ضرورت پر لحاظ کرتے ہوئے فاضل مصنف نے مضمون کو ایک مکمل رسالہ کی صورت میں پیش کر کے ملک اور قوم پر جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ فاضل مصنف کی بلند شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کی تصانیف اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہو کر ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں اس رسالہ میں بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ قرآن کریم سے استدلال کرتے ہوئے تاریخی پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت۔ مالی مشکلات کا تذکرہ پر از معلومات پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے بعض مذہبی اور اعتقادی مسائل جو ضمناً معرض بحث میں آئے ہیں ان کی توضیح بڑی خوبی سے کے ساتھ کی گئی ہے۔ سائنس کی ضرورت و اہمیت علماء کی سائنس سے بے اعتنائی و بے نیازی۔ یورپین اقوام کا سائنس کی بدولت عروج مسلمانوں کا زوال یہ وہ باتیں ہیں جو محتاج ثبوت نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا انحطاط اور ساری کمزوری

صرف اس بنا پر ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو عملاً چھوڑ دیا ہے ۔ احکام الٰہی کی پابندی نہیں ہے ۔ علماء نے آیات کے صحیح مفہوم اور معنی کو سمجھا ۔ لیکن عوام کے ذہن نشین کرنے میں کوتاہی کی ۔ خداوند تعالےٰ نے قرآن کو حکمت کے پہلو بہ پہلو رکھا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے یعلمہم الکتاب والحکمۃ تعلیم کرتے ہیں کتاب اور حکمت کی قرآن میں جابجا سورج ۔ چاند ۔ ستارے ۔ زمین ۔ پہاڑ ۔ سمندر ۔ غرض کہ عالم کی ہر شے پر غور و فکر تامل و تدبر کی تاکید اکید ہے ۔ ان سب کا ماحصل صرف یہ ہے کہ انسان مناظر قدرت پر غور کرے اور حقایق اشیاء کی معرفت حاصل کرے ۔ جسقدر مشاہدات سے بحث ہوگی اسی حد تک ذہن میں ترفع ہوگا ۔ اور اس رفعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان سائنس و حکمت کے ذریعہ سے آسمان کمال پر پہنچکر نہ صرف معراج ترقی کو پہنچے گا بلکہ حقیقی معنوں میں خلیفۃ اللہ کا مصداق بنے گا ۔ زمین کی سطح پر ۔ پہاڑوں کی چوٹی پر ۔ ہواؤں کے تموج میں ۔ سمندر کی لہروں میں ۔ آسمان کی فضا میں آج انسانی تصرفات کام کر رہے ہیں ۔ یہ سب سائنس اور حکمت کے ثمرات اور برکات ہیں ۔ شعر

آنکھ والا ترے جوبن کا نظارہ دیکھے ۔۔۔ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور علمائے اسلام خصوصاً اس رسالہ سے مستفید ہو کر سائنس و حکمت کی ترویج کا باعث ہوں گے ۔ تاکہ مسلم قوم ایجادات و اختراعات میں یورپ کے دوش بدوش رہ کر اپنی ہستی کو محفوظ و مامون رکھ سکے ۔ فقط

شہود ی جونپوری وکیل ہائی کورٹ

ریاست دتیا

مسلمان اور سائنس

قسط اوّل

مسلمانوں کے آج کل کے انحطاط اور زوال کے جہاں اور وجوہ ہیں وہاں ان میں ایک بہت بڑی وجہ ان کی سائنس کی طرف سے بے توجہی اور بے اعتنائی بھی ہے۔ عربی مدارس میں سائنس کو یک قلم نظر انداز ہی نہیں کیا جاتا بلکہ علمار کے گروہ میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ سائنس کی تعلیم اپنے متعلمین کو دہریت اور بے دینی کی طرف لیجاتی ہے۔ اس لئے علمار کا گروہ عام طور پر سائنس کی تعلیم و ترویج سے جہاں تک ہوسکتا ہے مسلمانوں کو روکتا ہے۔ موجودہ عربی مدارس میں جس قسم کی تعلیم ہوتی ہے اس نے اس قسم کا ماحول پیدا کردیا ہے کہ ان مدارس کا کوئی متعلم آزاد سائنٹفک اور علمی تحقیقات کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو بسا اوقات اس پر بے دینی اور الحاد کا الزام لگادیا جاتا ہے۔ ایسکا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کو آجکل کسی قسم کی سائنٹفک ایجادات کے موجد ہونے کا فخر حاصل نہیں ہے۔ جتنی بھی آجکل سائنٹفک ایجادات ہیں مثلاً ریل۔ تار کی تاربرقی۔ بے تار کی تاربرقی ہوٹر کار۔ دخانی جہاز۔ ہوائی جہاز۔ بارود۔ ڈنامائٹ اور بارود ڈنامائٹ سے چلنے والے جملہ آلات ان سب

کے موجد یورپین اقوام کے افراد ہیں۔ کیا ہم مسلمان اور ہمارے علماء اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ عالم کی جملہ مسلمان اقوام فہم وفراست عقل و ادراک میں یورپین اقوام سے کمتر اور فروتر ہیں۔ اور جہاں تک سائنٹفک ایجادات کا تعلق ہے ہم مسلمانوں کو یورپین اقوام کی برابری کی امید تو کیا ہمسری کا کبھی وہم وگمان بھی نہیں کرنا چاہیئے علماء کی طرف سے کہا جائے گا کہ ان سائنٹفک ایجادات سے کیا فائدہ۔ جو ہم ان کے درپے ہوکر اپنا وقت ضائع کرتے اور مسلمانوں کو اُن کے درپے کر کے مسلمانوں کا وقت ضائع کراتے۔ اس کا جواب مختصراً یہ ہے کہ یہ محض سائنٹفک ایجادات ہی ہیں جو آج کل بڑی حد تک قوموں کے عروج اور زوال کا باعث ہوئی ہیں۔

سائنٹفک ایجادات کا اثر قوموں کے عروج وزوال پر

جن صاحبان کو تاریخ عالم میں کبھی کچھ دخل ہے ان سے یہ بات ہرگز مخفی نہ ہوگی کہ یہ سائنٹفک ایجادات ہی ہیں جن کے باعث پچھلی دو تین صدی کے اندر تاریخ عالم کی کایا پلٹ ہوگئی۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا ایجادات میں سے صرف دو ایجادوں یعنی بارود (Gun powder) اور دخانی جہاز کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک بارود ایجاد نہیں ہوئی تھی اس وقت تک زیادہ تر مشرق والے مغرب والوں پر حملہ آور ہوتے تھے اور کامیابی کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ عربوں کی فتوحات مصر۔ طرابلس۔ مراکش۔ اسپین۔ جنوبی یورپ۔ مثل سسلی کریٹ وغیرہ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔ عربوں کی فتوحات کا سلسلہ جب بند ہوتے کو آیا تو ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

اور یہ بھی صدیوں تک جاری رہا۔ اس دوران میں ترکوں نے جنوب و مشرقی یورپ
کے اکثر ممالک مثل مقدونیہ۔ یونان۔ بلگیریا۔ سرویا فتح کرکے اپنے ممالک محروسہ میں
شامل کرلئے۔ یہاں تک کہ ان کے عروج کے زمانے میں ترکی فوجوں نے جاکر روم اور
وائنا کے دروازے تک کھٹکھٹائے۔ قسطنطنیہ ترک اس سے پہلے ہی فتح کرچکے تھے
علاوہ عثمانی ترکوں کے تاتاری فوجوں کے سیلاب قرون وسطیٰ میں اکثر یورپین ممالک
پر گذرتے رہتے تھے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری
رہا۔ اس دوران میں جب کبھی یورپ نے مشرق کا رخ کیا جیسا کہ صلیبی جنگوں کی صورت
میں تو بھی یورپ کو مشرقی اقوام کے مقابلہ میں کبھی معتدبہ یا دیرپا کامیابی نہیں ہوئی۔
سلطان صلاح الدین ایوبی کے وقت میں اگرچہ یورپ اپنی متفقہ قوت کے ساتھ جسمیں
رچارڈ کیورڈی۔ لائن بادشاہ انگلستان شہنشاہ فرانس اور یورپ کے بڑے بڑے
ڈیوک اور نائٹ معہ اپنی افواج کے شامل تھے۔ اور اگرچہ اس وقت اسلامی قوت
کا شیرازہ بکھر چکا تھا کیونکہ اس سے پیشتر ہلاکو خاں خلافت بغداد کو تباہ کرچکا تھا۔
تاہم صلاح الدین اس طوفان بے تمیزی کو اپنی واحد قوت سے روکنے میں یورپین
افواج کو پے در پے شکست دینے میں اور بیت المقدس کو عیسائیوں سے واپس
لینے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت لڑائی تیر و کمان۔ تیغ و تبر کے ذریعہ سے ہوتی تھی
اور ظاہر ہے کہ اس طریق کارزار میں مشرق مغرب پر فوقیت رکھتا تھا۔

اسی اثناء میں یورپ نے گن پاؤڈر یعنی بارود ایجاد کی اور محض اس ایک ایجاد
نے لڑائی کے رخ کو بدل دیا۔ بجائے اس کے کہ ایشیا یورپ پر حملہ آور ہو اب یورپ
ایشیا پر حملہ آور ہونے لگا جس کے نتائج یورپین اقوام کے مشرقی اقوام پر مستولی ہونیکی

صورت میں ظاہر ہیں۔ اسی طرح ایک دخانی جہاز کی ایجاد نے تجارت اور بیوپار کی دنیا میں ایسی کایا پلٹ کی اور مسلمانوں کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جس کی مثال معاشیات میں ملنا مشکل ہے جب تک کہ دخان کے ذریعہ سے جہازرانی کا علم ایجاد نہیں ہوا تھا اس وقت تک تمام تجارت جو ہندوستان ایران اور یورپ کے درمیان ہوتی تھی وہ عربوں اور مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھی اور عربی جہاز ہی تھے جو تمام اس تجارت کے جو عرب۔ افریقہ اور چین کے درمیان ہوتی تھی حامل تھے۔

اس دخان کی ایجاد نے ریلوں اور دخانی جہازوں کو وجود میں لاکر تمام یہ تجارت عربوں اور مسلمانوں سے چھین کر اہل یورپ کے ہاتھ میں دیدی۔ ان مثالوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی کیا علماء کا کوئی گروہ ایسا موجود ہو سکتا ہے جو سائنٹفک معلومات اور سائنٹفک ایجادات کی مخالفت کرے۔ ان مثالوں سے یہ پورے طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سائنٹفک معلومات کس قدر قوموں کے ترقی اور تنزل کا باعث ہو سکتی ہیں۔
اور اگر اور وجہ سے نہیں تو محض اعلاء کلمۃ اللہ کی غرض سے مسلمانوں پر فرض ہے کہ سائنٹفک تعلیم سائنٹفک معلومات کو اپنا مطمح نظر بنا دیں اور نیز یہ کہ جو لوگ اسکی مخالفت کرتے ہیں وہ اعلاء کلمۃ اللہ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مخالف ہیں۔ اسلام بجائے اس کے کہ سائنٹفک تحقیقات اور سائنٹفک معلومات حاصل کرنے کا مخالف ہو۔ خاص طور پر ایسی معلومات حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ سائنٹفک ایجادات کیا چیز ہیں محض یہی کہ فطرت کی قوتوں پر اپنی تحقیقات اور معلومات کے ذریعہ سے قابو حاصل کرنا۔ ذیل کی آیات قرآنی ملاحظہ ہوں۔

(۱) سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ط

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا
أَلْوَانُهُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ۝ اسی صنف کی ذیل کی آیت ہے
وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا
مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ
وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ
يَهْتَدُونَ ۝ (سورہ نحل رکوع دوم) وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا ۗ لَكُمْ فِيهَا
دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝

(۲) وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ
إِلَىٰ بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝
وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝
وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝
هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝
يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (سورہ نحل رکوع ۲) وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا
وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ ۝ (سورہ حم سجدہ رکوع ۲)

ہمارے لئے ان چیزوں کی تسخیر اس کی مقتضی ہے کہ ہم ان چیزوں کا علم کماحقہ حاصل
کرکے ان سے مستفید ہوں۔ مثلاً آیۃ کریمہ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا
طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ الخ میں
خداوند عالم نے جو مثلاً بحر کو ہمارے لئے مسخر کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ

دھرے بیٹھے رہیں۔ اور دریا سے لحماً طریّاً نکل کر خود بخود ہمارے کام و دہان میں آجاویگا یا یہ کہ سمندر سے موتی خود بخود برآمد ہوکر ہمارے استعمال کے لئے حاضر ہو جاویں گے یا یہ کہ کشتیاں خود بخود بنکر دریا میں چلنے لگیں گی اور ہم ان سے مستفید ہونے لگیں گے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ دریا و سمندر میں مچھلی وغیرہ کے شکار کرنیکے جو کچھ ذرائع ہیں وہ ہمکو سیکھنا و استعمال کرنا پڑینگے اسیطرح دریا سے موتی برآمد کرنے کیلئے فن غوّاصی حاصل کرنا پڑیگا اسی نمط پر جہازرانی کی سائنس علم و فن میں ہمکو مہارت حاصل کرنا ہوگی اس صورت میں ہی ہم کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سے سمندر کو تسخیر کرسکیں گے اور اس تسخیر کے ذریعہ سے اپنے آپ کو۔ اپنے ملک کو اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکیں گے۔ اب اس جہازرانی کے علم و فن میں جتنی زیادہ جو قوم ترقی کرتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس آیت کریمہ کی منشا کی تکمیل کرتی ہے۔ اور اس نسبت سے اپنی قوم اور ملک کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ جہازرانی کے لئے دخانی قوت کی ایجاد و آبدوز (یعنی زیر آب چلنے والی کشتیاں) کشتیوں کی ایجادات۔ جہازوں پر بے تار کی تار برقی کا استعمال یہ سب وہ باتیں ہیں جو سائنس ہم کو سکھلاتی ہے۔ اور ایسی سائنس کا حصول محض جائز ہی نہیں بلکہ عین منشاء خداوندی کے مطابق ہے۔ اسی طرح آیۃ کریمہ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ہم کو علم جغرافیہ اور علم ہیئت و نجوم حاصل کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ علاوہ بریں آیات متذکرہ صدر میں بہت سے دیگر علوم و سائنس کے حصول کی طرف اشارہ ہے یعنی آیات متذکرۃ الصدر میں ہم کو صاف طور پر یہ ہدایت کی گئی ہے کہ عالم شہود میں جو فطری قوتیں ہیں اور جن کو خداوند عالم نے اپنی ربوبیت سے اپنے بندوں کے لئے قابل تسخیر بنادیا ہے ان فطری قوتوں کو مسخر کرکے ان سے مستفید ہوں۔

جس طرح سمندر کو ہم مسخر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خداوند عالم نے ہم کو ہوا کی تسخیر کی بھی قدرت دی ہے اور اسی تسخیر کا نتیجہ آج کل کے ہوائی جہازات ہیں اور اس لئے ان ہوائی جہازات کے موجد نشاء خداوندی کو ہم مسلمانوں کے مقابلے میں بہتر طریقہ سے پورا کر رہے ہیں۔ پانی اور ہوا پر کیا موقوف ہے ہم خدا کی زمین میں جو کاشت اور زراعت کرتے ہیں اور اس سے ہمارے لئے رزق پیدا ہوتا ہے۔ یہ زمین کی تسخیر نہیں تو کیا ہے۔ نسل انسانی کے وجود کے دوران میں ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان فن زراعت سے ناواقف تھا۔ اور اس کی زندگی کا دارو مدار صرف شکار پر تھا۔ پھر کوئی محسن بنی نوع انسان پیدا ہوا۔ اور اس نے زمین سے بذریعہ کاشت غلّہ پیدا کرنا ایجاد کیا اور زراعت کی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان لوہے کے وجود سے ناواقف تھا اور اس کے سب برتن ہتھیار وغیرہ پتھر کے ہوتے تھے کوئی صاحب دماغ محسن بنی نوع انسان پیدا ہوا اور اس نے لوہے کے وجود کو دریافت کیا اور اس کا استعمال اپنے ہم جنسوں کو سکھایا۔ آجکل جن اہل بصیرت نے سائنس کی مدد سے نئی نئی ایجادات مثل بجلی۔ دخان کے کی ہیں انھوں نے اس بارے میں نہ صرف منشاء خداوندی کو پورا کیا ہے بلکہ بنی نوع انسان کو ان ایجادات کے ذریعہ سے ایک گران بہا فائدہ پہنچا کر ان پر بے حدو حساب احسان کیا ہے اگر ہم مسلمان بھی کسی مفید ایجاد کے موجد ہوتے تو ہم کو بھی بنی نوع انسان کے محسن ہونے کا فخر حاصل ہوتا جس سے ہم اس وقت بالکل محروم ہیں۔ جو کچھ عرض کیا گیا اُس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ سائنس اور جملہ وہ علوم جو ان فطری قوتوں کو مسخر کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں حاصل کریں اور اس حصول علم کے ذریعہ سے اپنے آپ کو

اور اپنے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچائیں۔

لہٰذا اگر علماء کا کوئی گروہ سائنس کے حصول کی مخالفت کرتا ہے تو وہ بداہتاً منشاء خداوندی کے خلاف کرتا ہے اور مسلمانوں نے پچھلی دو تین صدیوں میں سائنس کے سیکھنے اور ہر قسم کے علوم جدیدہ کے حاصل کرنے سے اجتناب کر کے منشاء خداوندی ہی کی مخالفت کی یہ اسی کی پاداش ہے کہ آج مسلمان قومیں اقوام یورپ و نیز دیگر اقوام سے ہر شعبۂ ترقی میں اس قدر پیچھے ہیں۔ یہاں تک سائنس کی ضرورت اور فطری قوتوں کی تسخیر کو نقل (یعنی نص قرآنی) سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اسی ضرورت کو عقلاً بھی ثابت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ اگر ہم ذرا بھی غور اور تامل سے کام لیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ انسان اور حیوان میں اگر کوئی چیز مابہ الامتیاز ہے تو وہ یہی فطری قوتوں کی تسخیر کی قابلیت یا عدم قابلیت ہے حیوان ابتدائے آفرینش سے جس حالت میں ہیں اسی حالت میں ابتک چلے آتے ہیں۔ وہ بحر و بر۔ حجر و شجر۔ ابر و باد پر کوئی عمل تسخیر کر کے ان چیزوں کو اپنا محکوم نہیں بنا سکتے۔ اگر کسی جانور کو دریا پار کرنا ہے اور فطرت نے اس جانور کو تیرنے کی قابلیت ودیعت نہیں کی ہے تو وہ اور اس کی جنس کے دوسرے جانور یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ وہ کشتی بنا کر یا پل تعمیر کر کے اس دریا کو عبور کر سکیں۔ اسی طرح قدرت نے ان کے کھانے پینے کا سامان قدرتاً مہیا کر دیا ہے۔ اگر اتفاقاً اس سامان میں کمی آجاوے تو حیوانات بذریعہ کاشت مزید سامان پیدا نہیں کر سکتے۔ نہ اپنے پہننے کے لئے کپڑا تیار کر سکتے ہیں۔ نہ سردی سے بچنے کے لیے آگ۔ مخلوق خداوندی میں انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو یہ سب کام کر سکتا ہے۔ اس لئے انسان کو اس کی یہ قابلیت تسخیر دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے انسانوں میں جو

افراد یا قومیں اس قابلیت سے جتنی زیادہ متصف ہیں اتنی ہی وہ حیوانات سے ممتاز تر ہیں اور جن قوموں میں جتنی کم اس تسخیر کی قابلیت ہے اتنی ہی وہ قومیں حیوانات سے قریب تر ہیں۔ لہذا اگر ہم لوگ حیوانات سے قریب تر اپنے آپ کو ثابت کرنا نہیں چاہتے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ مختلف علوم اور سائنس میں توغل حاصل کر کے اس تسخیر کے عمل میں دیگر اقوام عالم کے دوش بدوش چلیں۔ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا اس سے سائنس کے حاصل کرنیکی ضرورت عقل اور نقل دونوں کے ذریعہ سے اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے اور مجھ کو امید ہے کہ علماء کا گروہ بھی مجھ سے متفق ہو کر اس کے ہر ممکن طریقے سے حاصل کرنے کا فتوی دے گا اور مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے اس کے حصول کی ترغیب دیگا اور نیز موجودہ عربی مدارس میں اس کی تعلیم کو ضروری قرار دے گا۔ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر علماء فوراً جدید سائنس کی تعلیم کی ضرورت کو تسلیم بھی کریں اور اس کے خواہشمند بھی ہو جائیں کہ جدید سائنس عربی مدارس کے درس میں شامل کر دی جائے تاہم اس مقصد کے حصول میں انکو اور عام مسلمانوں کو بیحد دشواریوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں کے سوا (ہاں اب جاپانی زبان میں بھی ایسی کتابوں کے ترجمے ہو گئے ہیں) دوسری زبانوں میں اس جدید سائنس کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہی نہیں ہے۔

مصر میں عربی میں کچھ کتابوں کے ترجمے غالباً ہوئے ہیں اور دار الترجمہ حیدرآباد نے بھی غالباً کچھ ترجمے کئے ہیں لیکن ان تراجم کی تعداد اصلی ذخیرہ کے مقابلے میں مثل نفی کے ہے۔ تاہم اگر علماء کا گروہ اس ضرورت کو تسلیم کر لے اور جدید سائنس کا جویا بنجائے تو کوئی نہ کوئی صورت حصول مقصد کی نکل ہی آوے گی۔ واللہ التوفیق یا اللہ یہ عرض کرنا

بھی کچھ بیجا نہ ہوگا کہ میں نے جو جدید سائنس کے حصول کی طرف مسلمانوں کو عموماً اور علماء کو خصوصاً توجہ دلائی ہے اسکا منشا مسلمانوں کے لئے محض حصول نام و نمود نہیں ہے یعنی یہ کہ جب غیر مسلم اقوام کو نئی نئی ایجادات کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے تو مسلمان اس امتیاز سے کیوں محروم رہیں بلکہ میری رائے میں مسلمانوں کو دوسری اقوام کے مقابلے میں محض اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جدید سائنس کی معلومات میں دیگر اقوام عالم کے دوش بدوش رہیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو زندگی کی ضرورتوں کے ہر شعبے یعنی تجارت۔ زراعت۔ فلاحت۔ طبابت وغیرہ میں غیر مسلم اقوام سے پیچھے رہیں گے جو مسلمانوں اور اسلام کے مزید تنزل اور زوال کا باعث ہوگا۔ جس کو مجھے امید ہے کہ ہمارے علماء ہرگز گوارا نہیں فرمائیں گے لہذا ضروری ہے اور اشد ضروری ہے کہ علماء فوراً اپنا فتویٰ جدید سائنس کے سیکھنے یا نہ سیکھنے کے متعلق صادر فرمائیں اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے خود علماء جدید سائنس کے حصول کی ضرورت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کریں اور مسلمانوں میں جو سائنس کی طرف سے اجتناب علماء کے رویہ کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے اس کو خود علماء اپنی جدوجہد سے دور کریں۔ کیونکہ اگر علماء کے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں نے ابتک من حیثیت القوم سائنس کے حصول سے اجتناب کیا اور اسی اجتناب کی وجہ سے مسلمان زندگی کی کشمکش میں دیگر اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے۔ اور مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچا تو علماء کا فرض ہے کہ جہانتک ان کے امکان میں ہو تلافی مافات کریں۔ اگر میری معروضات کی بنا پر علماء کا گروہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید سائنس کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہی نہیں۔ بلکہ انکے بقا کے لئے نہایت ضروری ہے تو اس خیال کی تبلیغ مسلمانوں میں ہر امکانی طریقے

سے کریں ۔

یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جدید سائنس کے حصول کی بابت علمار کا کوئی مشروط فتویٰ مثلاً یہ کہ جدید سائنس کا پڑھنا پڑھانا جائز ہے بشرطیکہ "وہ اپنے متعلمین کو دہریت اور الحاد کی طرف نہ لیجاتا ہو" کچھ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر کوئی شخص جدید سائنس سیکھنا چاہتا ہے تو وہ پہلے سے کیسے جان سکتا ہے کہ جدید سائنس کے حصول کا اس کے معتقدات پر کیا اثر ہوگا ۔ یہ خود علمار کا فرض ہے کہ وہ معلوم کریں کہ جدید سائنس کیا چیز ہے اور اسلام جیسے مذہب کی بنیادیں جس کی بابت علمار کا دعویٰ ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ وہی واحد مذہب ہے جو عقل کی کسوٹی پر پورا اتر سکتا ہے سائنس کی روشنی سے متزلزل ہو سکتی ہیں یا نہیں اور اگر علمار کو خود معلوم نہیں کہ سائنس کیا چیز ہے تو جو کچھ تھوڑے بہت مسلمانوں میں سائنسداں موجود ہیں ان سے اس کی حقیقت کا علم حاصل کریں اور تب اپنا فیصلہ صادر کریں ۔ راقم الحروف اگرچہ کوئی سائنسداں نہیں ہے مگر جو کچھ وہ سائنس کا مفہوم سمجھتا ہے وہ عرض کئے دیتا ہے ۔

سائنس نام ہے جملہ مظاہر قدرت کی بابت صحیح صحیح معلومات حاصل کرنیکا اور جدید سائنس انھیں مظاہر قدرت کی بابت آخر سے آخر معلومات کا ۔ چنانچہ (Botany) نام ہے اس سائنس یا علم کا جس میں اشجار و اثمار کی بابت صحیح سے صحیح اور آخر سے آخر معلومات ہو (Geology)[له] نام ہے اس سائنس یا علم کا جس میں طبقات ارض کی بابت صحیح ترین معلومات ہو انھیں پر دیگر سائنسوں یا علوم کو بھی قیاس

له (Anatomy) نام ہے اس سائنس یا علم کا جس میں انسانی جسم کی بابت صحیح سے صحیح اور آخر سے آخر معلومات ہو ۔

کرلیا جاوے۔

راقم الحروف کے نزدیک توان حقائق سے واقفیت ہرگز ہمارے اسلامی عقائد کو متزلزل نہیں کرسکتی۔ اگر علماء کا خیال اس کے خلاف ہے تو وہ دوسری بات ہے بہرحال راقم الحروف کے نزدیک مسلمانوں کے لئے جدید سائنس کا حاصل کرنا آج کل فرض کفایہ کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور مجھ کو امید ہے کہ علماء دین بھی میری اس رائے سے اتفاق کرکے عوام کو جدید سائنس کے حصول کی طرف ہر ممکن طریقے سے متوجہ کریں گے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اسمیں میرے مخاطب علماء کا گروہ اور پرانے تعلیم یافتہ اصحاب ہیں اب مسئلہ زیربحث کے متعلق چند الفاظ نئے تعلیمیافتہ گروہ کی خدمت میں بھی عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارا نیا تعلیم یافتہ گروہ اور نئی تعلیم کے اسلامی ادارے مثلاً مسلم یونیورسٹی علیگڈھ یا اسلامیہ کالج لاہور اگرچہ سائنٹفک تعلیم کے مخالف نہیں ہیں مگر ان تعلیمی مرکزوں میں بھی سائنس کی تعلیم پر اب تک وہ توجہ نہیں دی گئی ہے جسکی ایسی تعلیم مستحق ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہ تعلیمی مرکز بھی ابتک ایک بھی ایسا سائنسداں پیدا نہیں کرسکے جسکو سائنس میں ایک محقق کا مرتبہ دیا جاسکے اسلئے ان اسلامی تعلیمی اداروں کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں بھی گذارش ہے کہ وہ ایسا انتظام فرمادیں کہ آئندہ اسلامی تعلیم کا یہ نقص دور ہوجائے اور یہ اسلامی درسگاہیں سائنس کے محقق پیدا کرسکیں وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

قسط دوم

کچھ عرصہ ہوا میں نے بعنوان بالا ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ کی صورت میں

بھی شائع ہوگیا ہے اس مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ سائنس کی تعلیم و تعلم کی طرف سے بے توجہی کے باعث مسلمانوں کو اور اسلام کو بیحد نقصان پہنچا ہے اور اب بھی پہنچ رہا ہے اور آئندہ بھی پہنچنے کا سخت خطرہ ہے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کے زوال کے جہاں اور وجوہ ہیں ان میں ایک بڑی وجہ انکی سائنس سے ناواقفیت بھی ہے۔ اس مضمون کو راقم الحروف نے متعدد علماء کرام کی خدمت میں ان کی اظہار رائے کے لئے روانہ کیا تھا جن میں سے چند بزرگوں نے اپنی رائے سے مطلع فرماکر راقم الحروف کی حوصلہ افزائی فرمائی جنمیں سے دو بزرگوں کی رائیں ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہیں۔

(۱) حضرت مولانا مولوی مفتی کفایت اللہ صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ و صدر جمعیۃ علماء ہند اپنے مکرمت نامہ مرقومہ ۱۵ الحجہ ۵۳ھ میں حسب ذیل رائے کا اظہار فرماتے ہیں

جناب مکرم بعد سلام مسنون رسالہ "مسلمان اور سائنس" میں نے دیکھا اس کی تفاصیل پر رداً و قبولاً بحث کرنا تطویل غیر اہم میں داخل ہے۔ اجمالاً اس قدر عرض کرسکتا ہوں کہ سائنس سے کام لینے کو شریعت مقدسہ نے منع نہیں فرمایا اور جہانتک مادیات میں تصرف کرکے ان کو مفید اور کارآمد بنانے کا تعلق ہے اسمیں ممانعت کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ دنیوی مفاد کے لحاظ سے مسلمان اگر دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنا چاہیں تو ان کے لئے سائنس کی ایجادات کو اختیار کرنا بھی ضروری ہے اسمیں دو رائے نہیں ہوسکتیں "۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ۔ دہلی

---

(۲) جناب مولانا میرک شاہ صاحب مدرس مدرسہ اشاعت العلوم سرائے

خام بریلی کی تحریر حسب ذیل ہے -

جناب محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ مجھے ایک رسالہ بعنوان "مسلمان اور سائنس" پڑھکر مسرت حاصل ہوئی میں آپ کی اس فرمائش کو اس وقت پورا کرنا نہیں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے متعلق فتوی یا رسالہ لکھوں کیونکہ میرے خیال میں یہ سوال بدون رسالہ یا فتوی بھی حل ہو سکتا ہے۔ یا کم سے کم اس وقت رسالہ یا فتوی قبل از وقت ہوگا۔ اس لئے کہ بہت سے فارغ التحصیل عربی خواں ہیں جن کو میں اس وقت سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہم کر سکتا ہوں۔ لیکن افسوس تو اس امر کا ہے کہ بجز انگریزی مدارس کے اس کی تحصیل ناممکن ہے اور وہاں انگریزی زبان کی واقفیت کے علاوہ مصارف کی بھی اسقدر ضرورت ہے کہ عربی طلباء کی برداشت سے باہر ہے۔ مصر میں یا حیدرآباد میں بھی درحقیقت اس مسئلہ میں ابھی کچھ نہیں کیا گیا ہے حیدرآباد کی کوتاہی پر مجھے سخت افسوس ہے۔ میں نے خود عرصہ تک اس علم کی تفتیش کی مگر کوئی سامان نہ ملا۔ بالآخر بیروت کی ایک کتاب ملی جسکو بلا آلات کے پڑھا اور اصول معلوم کئے۔ ریاضی کی ایک کتاب مصر میں ایک دفعہ چھپکر ناپید ہو گئی۔ اس کے لئے مصر لکھا گیا۔ جواب نفی میں ملا اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اگر آپ عملی کام کرنا چاہتے ہیں تو ایک عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالدیجائے جسمیں موجودہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو لیا جائے اور ان کو چھ ماہ تک صرف انگریزی لغت سکھائی جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں چھ مہینوں میں اردو میں ترجمہ شدہ سائنس کے رسالہ جات پڑھا دیئے جائیں۔ چھ ماہ کے بعد جسقدر عربی میں یا انگریزی میں کتب تصنیف ہوئی ہیں ان کو وہ پڑھائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش کی جائے کہ

یورپین زبانوں سے اسی طرح حکمت جدیدہ کو مشرقی زبانوں میں منتقل کیا جاوے
جس طرح خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں یونانی سے فلسفہ کو منتقل کیا تھا۔ آپ
رؤسا میں سے ہیں اگر آپ ابنائے جنس سے مل کر یہ ساز و سامان بہم فرما سکتے
ہیں تو میں بھی انشاء اللہ ہر عملی خدمت کے لئے آپ کا ساتھ دوں گا۔ ورنہ محض
فتویٰ یا رسالہ، یا اسی قسم کا کوئی پروپیگنڈا اس معاملے میں میرے نزدیک بالکل غیر ضروری ہے
ہے۔ سائنس کو اگر کوئی حرام کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تسخیر عناصر حرام ہے
یا ضروریات زندگی کو سائنٹفک طریقوں سے بنانا یا اس کا سیکھنا حرام ہے۔
وہ ان عقائد کو حرام کہتے ہیں جو جاہل سائنسدانوں میں اسلئے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ سائنس
کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ میں نے بدعقیدہ سائنسدانوں سے مکالمہ کیا تو معلوم ہوا
کہ وہ اتنا بھی سائنس کے اصولوں کو نہیں سمجھتے جتنا میں نے اسے سرسری مطالعہ
سے معلوم کیا ہے۔ البتہ تجارب ان کے زیادہ ہوتے ہیں میرے خیال میں جس شخص
کی اسلامی تعلیم بھی کامل ہو اور سائنس بھی کامل ہو اس کے عقاید اسلامی میں کبھی تزلزل
پیدا ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ بہت سے سائنس کے مسائل اسلام کے اصولوں کو
منواتے ہیں اس لئے میرے نزدیک سائنس پڑھنے کے اہل صرف وہ لوگ ہیں
جن کی اسلامی تعلیم باقاعدہ طور پر مکمل ہو چکی ہو۔ جس کا واحد طریقہ وہی ہے جو اوپر
میں نے عرض کیا ہے۔ اگر اسمیں مفید مشورہ فرمانا چاہیں تو میں اسمیں ہر وقت شرکت
کیلئے تیار ہوں۔ مگر میں کام کو پسند کرتا ہوں، محض پروپیگنڈہ نہیں۔ فقط والسلام

عبدہ میرک شاہ عفاء اللہ عنہ و عافاہ جامع اشاعت العلوم سرائے تام بریلی

اس امر کا افسوس ہے کہ علمائے کرام میں سے اکثر بزرگوں نے کوئی جواب نہیں

دیا یا اگر جواب دیا تو اظہار رائے سے اجتناب فرمایا۔ تاہم اس بات کی خوشی ہے کہ جن بزرگوں نے اظہار رائے فرمایا انھوں نے زور دار الفاظ میں میرے معروضات کی تائید کی یہ امر بھی خاص طور پر اطمینان دلانے والا ہے کہ کسی بزرگ نے مخالفت میں قلم نہیں اٹھایا۔

میں نے اپنا رسالہ "مسلمان اور سائنس" مدیر الفرقان کی خدمت میں بھی واسطے اشاعت اور تنقید کے روانہ کیا تھا۔ مدیر الفرقان میرے مضمون کو اپنے رسالہ میں شائع نہ کرسکے مگر صاحب موصوف نے اس پر تبصرہ اپنے ماہ رجب المرجب کے پرچہ میں شائع کیا ہے۔ اس تبصرہ میں فاضل مدیر نے اگرچہ بعض جزئی باتوں میں مجھ سے اختلاف کیا ہے تاہم فی الجملہ میری تائید فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں "بہر حال سائنس بحیثیت اس کے کہ وہ ایک علم ہے اور اسکے ذریعہ سے مظاہر قدرت کے متعلق جدید انکشافات بقدر طاقت بشریہ حاصل کئے جا سکتے ہیں اسکے سیکھنے سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔"

جبکہ میرے مضمون کی مختلف جوانب سے تائید ہوئی اور کسی جانب سے بحمد اللہ اسکی مخالفت میں صدا بلند نہیں ہوئی تو ایک مضمون نگار کی حیثیت سے مجھ کو اپنے دل میں بہت خوش ہو کر ساکت و صامت ہو جانا چاہیئے تھا مگر میرا مقصد اس مضمون کی تحریر و اشاعت سے اپنے لئے ذاتی خوشی یا اطمینان کا حصول نہیں تھا بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ اگر سائنس کی عدم واقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچا ہے اور اب بھی پہنچ رہا ہے تو تلافی مافات کے طور پر علماء کیطرف سے اور نیز عام مسلمانوں کی طرف سے کوئی عملی کارروائی کیجائے تاکہ آئندہ کے لئے مسلمان اس نقصان سے محفوظ رہیں ظاہر ہے کہ یہ مقصد ابتک بالکل حاصل نہیں ہوا۔

میں نے رسالہ "مسلمان اور سائنس" میں اس بات کی تاریخی شہادت پیش کی ہے کہ مسلمانوں کی سائنس سے عدم واقفیت منجملہ دیگر وجوہ کے ایک بڑی وجہ ان کے قومی زوال کی ہے۔ مثال میں میں نے دخانی جہاز کی ایجاد کو پیش کیا تھا جس ایجاد نے اہلِ یورپ کو عربوں اور مسلمانوں پر فن جہاز رانی میں ایسا تفوق دیا کہ عربوں کی جو تجارت ہندوستان اور مشرقِ اقصےٰ سے تھی وہ سب چھن کر اہلِ یورپ کے ہاتھ میں چلی گئی۔ علامہ مولانا سید سلیمان ندوی نے چار خطبے عربوں کی جہاز رانی پر ۱۹۳۱ء میں بمبئی میں دیئے تھے وہ خطبے اب کتاب کی صورت میں "عربوں کی جہاز رانی" کے نام سے مطبع معارف اعظم گڈھ سے طبع ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔ اس کتاب میں بڑی گراں بہا معلومات عربوں کی جہاز رانی کے متعلق جمع کی گئی ہیں جس وقت میں نے اپنا مضمون لکھا تھا تو اس وقت مولانا کے یہ خطبات میرے پیش نظر نہیں تھے۔ مگر مجھ کو نہایت خوشی ہے کہ مولانا نے جو واقعات عربوں کی جہاز رانی کے متعلق لکھے ہیں ان سے میرے معروضات کی پوری تائید ہوتی ہے۔ مولانا کی کتاب کے مطالعہ سے ناظرین کرام کو معلوم ہوگا کہ قرون وسطیٰ میں نہ صرف ہندوستان، جزائر ہند اور چین کی جملہ تجارت اہل عرب کے ہاتھ میں تھی بلکہ بحر روم اور اسکی تجارت کے بڑے حصہ پر بھی صدیوں تک اہل عرب اور عرب جہاز رانوں کا قبضہ رہا۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۸۱ اور ۸۲ پر مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

عربوں کی بحری ترقی کا خاتمہ دسویں صدی ہجری میں ہو جاتا ہے.......

اب تک خلیج فارس، مصر، عرب، حبش، افریقہ، ہندوستان اور جزائر ہند کی بحری تجارت پر تنہا عرب جہاز ران حکومت کر رہے تھے دفعتًا ان نو وارد جہاز رانوں کے آنے سے (نو وارد جہاز رانوں سے مولانا کی مراد

پرتگالی، ہالینڈی (ڈچ) فرانسیسی اور انگریزی جہازراں ہیں۔) عربوں کے ہزار
سالہ نظام بحری کے شیرازے بکھرنے لگے خصوصاً پرتگالیوں نے اس ظلم
وسفاکی کے ساتھ عرب ساحلوں اور جہازوں کو برباد کرنا شروع کیا کہ چند
ہی سال کے اندر عرب ایک ایک ساحل اور جزیرہ سے بیدخل ہونے لگے"
یورپین جہازرانوں کو جو یہ تفوق عرب جہازرانوں پر حاصل ہوا وہ محض اس وجہ سے
کہ وہ خود اور انکے جہازات عربوں کے جہازات کے مقابلے میں یورپین اقوام کی سائنسدانی کیوجہ سے
بہتر مسلح ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر مزید تاریخی شہادت کی ضرورت ہو تو وہ
ہر جگہ چپ و راست اس امر کو ثابت کرنے کیلئے کافی اور وافی مل سکتی ہے۔ کہ یورپ
اور امریکہ کا عروج اور ایشیا اور افریقہ کا زوال بڑی حد تک اول الذکر ممالک کی
سائنسدانی اور سائنسدانی کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں نئے نئے اختراعات
اور نئی نئی ایجادات کی وجہ سے ہے اور ایشیا اور افریقہ کا زوال انھیں چیزوں سے
عدم واقفیت کی وجہ سے ہے ایشیا کے صرف ایک ملک جاپان نے سائنٹفک معلومات
میں پچھلی نصف صدی کے اندر یورپ اور امریکہ کی برابری حاصل کی ہے جسکا یہ نتیجہ ہے کہ
جاپان نہ صرف فوجی حیثیت سے بلکہ تجارتی حیثیت سے یورپ اور امریکہ کے ترقی سے
ترقی یافتہ ملک کا برابری کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہے۔ لہذا اس کلیہ سے تو انکار نہیں کیا
جاسکتا کہ سائنسدانی آجکل بڑی حد تک قوموں کی ترقی اور تنزل کا باعث ہوئی ہے۔ اسلئے
تاریخی حیثیت سے ہم کو یہ جانچنا ہے کہ آیا سائنس کی عدم واقفیت ایک بڑی حد تک
ہمارے تنزل کا باعث ہوئی ہے یا نہیں اور اسوقت جو ہم زندگی کی کشمکش میں

اقوام عالم سے پیچھے ہیں اسمیں ہماری سائنس سے عدم واقفیت کو کچھ دخل ہے یا نہیں۔
جو علماء کرام میرے معروضات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ ہوں وہ خود ضروری غور وخوض کے بعد تاریخی حیثیت سے ان سوالوں کا جواب دیں۔ اور اگر وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں جس پر میں پہنچا ہوں تو علماء کیلئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ محض سائنس کی تعلیم کے جواز کا فتویٰ دیکر خاموش ہو جائیں۔ بلکہ ان پر فرض ہے کہ ہر امکانی کوشش سے مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم کی ترویج کریں اور اگر پچھلے عرصہ میں علماء کے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم کی طرف سے اجتناب پیدا ہوا ہے تب تو علماء پر اور بھی فرض ہے کہ تلافی مافات کرنے کی کوشش کریں اور تحریر وتقریر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو جدید سائنس کے حصول کیلئے آمادہ کریں۔ اور ان کیلئے اس کے حصول کے مواقع پیدا کریں۔ اس غرض کے حصول کیلئے کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ مدارس سائنس کو اپنے نصاب کا جزو لاینفک قرار دیں۔ اگر ہر عربی مدرسہ اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا تو از کم ایسے عربی مدارس جیسے کہ دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوہ جدید سائنس کو اپنے نصاب میں داخل کر کے سائنس کی تعلیم کے اجراء کی ابتدا ضرور کر سکتے ہیں۔
فاضل مدیر الفرقان نے جو تبصرہ میرے رسالہ "مسلمان اور سائنس" پر اپنی اشاعت ماہ رجب میں تحریر فرمایا ہے اسمیں صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔ "ہمارے نزدیک سائنس کی صرف تحصیل وتعلیم کے جواز میں کسی کو کلام نہ ہوگا" اور یہ بھی خیال ہمارے نزدیک درست نہیں کہ سائنس کا محض سیکھنا انسان کو ملحد بنا دیتا ہے بلکہ الحاد اور دینی بے قیدی درحقیقت اس ماحول اور سوسائٹی کے اثرات ہیں جسمیں عام طور پر طالبین علوم مغربیہ کو مبتلا ہونا پڑتا ہے" لہذا عربی مدارس میں سائنس کی تعلیم

کے اجراء سے فاضل مدیر الفرقان اور ان کے ہم خیال علماء کو جو خطرہ بابت مضر اثرات ماحول اور سوسائٹی کے پیدا ہوتا ہے وہ بھی جاتا رہیگا۔ جن بزرگوں کو باوجود اقرار جواز تعلیم و تعلم سائنس عربی مدارس میں سائنس کی تعلیم کا اجراء پسند نہ ہوگا وہ غالباً فرمادیں گے کہ ہم تقسیم عمل کے اصول پر عمل پیرا ہیں اسلئے عربی مدارس کو ہم نے صرف دینیات کیلئے مخصوص کردیا ہے۔ سائنس کی تعلیم کیلئے بہت سے ادارے جو محض دنیاوی تعلیم دیتے ہیں کھلے ہوئے ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ عربی مدارس میں بھی سائنس کو داخل کیا جائے اسکا جواب اول تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کا یہ عذر کہ ہم تقسیم عمل کے اصول پر صرف دینیات کی تعلیم ہی عربی مدارس میں ضروری خیال کرتے ہیں اس وقت قابل پذیرائی ہوتا جب علماء نے ان دیگر اداروں کے منتظمین کے ساتھ بیٹھکر واقعی آپس میں تقسیم عمل کیا ہوتا اور وہ سب دیگر تعلیمی ادارے علماء کی طرف سے سارٹیفکٹ مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہوتے۔ ثانیاً یہ کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے علماء اور عربی مدارس کے تعلیمیافتہ حضرات جدید سائنس اور جملہ علوم حاضرہ سے بالکل نابلد رکھے جاویں۔

کیا مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں اسلامی مدارس کے طلبہ سوائے دینیات کے جملہ علوم متداولہ مروجہ سے محروم رکھے جاتے تھے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف نے یونان کی اس وقت کی تمام علمی معلومات کو عربی میں ترجمہ کرکے موجودہ علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ کیا ہمارے زمانہ کے علما بغیر اسکے کہ ان کو موجودہ سائنس اور فلسفہ سے کچھ بھی واقفیت ہو کسی ایسے علم کلام کی بنیاد ڈال سکتے ہیں جسکے ذریعہ سے آجکل کے فلسفیوں اور سائنسدانوں کے اعتراضات کا اسلام کی طرف سے جواب دیا جاسکے۔ بہر حال جبکہ سائنس کی تعلیم جائز اور مفید ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عربی مدارس کے

تعلیمی نصاب کا جزو نہ بنے۔ عربی مدارس میں سائنس کی تعلیم کے اجراء سے علاوہ دیگر مفاد کے خاص فائدہ یہ ہوگا کہ سائنس کی تعلیم کی طرف سے جو دینی خدشہ مسلمانوں کے دلوں میں راسخ ہوگیا ہے وہ دور ہو جائیگا اور عام مسلمانوں پر آزادی کے ساتھ علمی تحقیقات کا دروازہ کھل جائیگا۔

فاضل مدیر الفرقان نے اپنے تبصرہ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے "لیکن یہ خیال ہمارے نزدیک صحیح نہیں کہ صرف سائنس کا علم حاصل کرنے سے مسلمان دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چل سکے گا"

سائنس کی تعلیم مسلمانوں کی راہ سے موانع ترقی میں سے ایک بڑا مانع ترقی دور کر دیگی۔ اور ان میں آزادانہ علمی تحقیقات کی روح پھونک دے گی اگر کوئی قوم پستی اور زوال کی حالت میں ہے تو اسکے بہی خواہوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس پستی کے اسباب علل دریافت کریں۔ اور جب اسباب دریافت ہو جائیں تو ان کے دور کرنے کی کوشش میں (السعی منی والاتمام من اللہ) کے زریں اصول پر عمل پیرا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقہ پر عمل کرتے سے اگر دیگر اقوام ترقی کر سکتی ہیں تو ہم مسلمان کیوں ترقی سے محروم رہیں۔ البتہ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور اپنی موجودہ حالت کو اپنے اعمال کے کرتوت نہ تصور کریں۔ بلکہ نعوذ باللہ بلا وجہ خداوندی عتاب کا نتیجہ خیال کریں۔ تب البتہ ہم کوئی قدم قومی ترقی کیطرف نہیں اٹھا سکتے۔ آگے چل کر فاضل مدیر الفرقان اسی سلسلے میں فرماتے ہیں "درحقیقت جب تک مسلمان غلام اور ان کی ذہنیت غلامانہ ہے وہ دنیا کے میدان مسابقت میں صرف ان جدید انکشافات کی علمی سیر سے دوسری آزاد اور خود مختار قوموں کا

مقابلہ نہیں کرسکتا "!

اگر فاضل مدیر کا یہ نظریہ صحیح ہے کہ مسلمان غلام ہیں اور انکی ذہنیت غلامانہ ہے تو فاضل مدیر پر لازم تھا کہ وہ مسلمانوں کی اس غلامانہ ذہنیت کے اسباب و وجوہ سے بحث کرتے اور انکے دور کرنے کی تدابیر پیش کرتے ۔

قسط سوئم

اس عنوان سے میرے دو مضمون اس سے پہلے بعض اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج کی صحبت میں میں اس نقصان عظیم کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں جو مسلمانوں کو سائنس کی عدم واقفیت سے زمانہ ماسبق میں پہنچا اور اب بھی پہنچ رہا ہے۔

ولایت فلسطین میں شہر بیت المقدس سے کچھ فاصلہ پر بحر میت (جسکو انگریزی زبان میں (Dead Sea) کہتے ہیں) واقع ہے یہ ایک نہایت وسیع تختۂ آب ہے جسکی سطح سمندر کی سطح سے نیچی ہے ۔ زمین پر پانی کی جتنی بھی چھوٹی بڑی جھیلیں ہیں ان سب کا پانی شیریں ہوتا ہے۔ بحر میت ہی صرف ایک ایسی بہت بڑی جھیل یا تختۂ آب ہے جس کا پانی شور ہے اور شور بھی ایسا کہ سمندر کے آب شور سے کہیں زیادہ ۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے پانی کی شوریت اس درجہ ہے کہ اس کا پانی معمولی پانی سے کہیں زیادہ وزنی ہے جسکا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اس سمندر میں گر جائے تو ڈوب نہیں سکتا۔

یورپ کے سائنسدانوں اور محققین کا خیال ہے کہ بحر میت کے پانی میں نمک، سوڈا، فاسفورس اور اسی قسم کے دیگر اجزاء اس کثرت سے موجود ہیں کہ اگر یہ سب اجزاء پانی سے اخذ کر لئے جائیں تو تمام دنیا کی نمک سوڈا وغیرہ کی ضرورتوں کو ایک عرصہ

تک پورا کر سکتے ہیں اور نکالنے والی قوموں کیلئے بے انتہا منفعت کا باعث بن سکتے ہیں۔ چنانچہ جنگ عظیم کے اختتام پر جب ولایت فلسطین انگریزی اقتدار میں آ گئی تو اس بحر میت سے نمک، سوڈا، فاسفورس، وغیرہ کے نکالنے کیلئے متعدد کمپنیاں بن گئیں اور ان اشیا کے اس سمندر سے برآمد کرنیکا کام شروع کر دیا گیا۔

چنانچہ راقم الحروف کو جب ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء میں فلسطین جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اس نے خود دیکھا تھا کہ بحر میت کے کنارے کھیت کے کھیت ہیں جن میں بحر میت سے نکلے ہوئے نمک سوڈا وغیرہ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔

ولایت فلسطین کو ایک سائنسداں قوم کے زیر اقتدار آئے ہوئے پندرہ بیس سال سے زائد عرصہ نہیں گذرا ہے کہ بحر میت اپنی مخفی دولت کو انگریزی قوم کے مفاد کیلئے خصوصاً اور بنی نوع انسان کے مفاد کیلئے عموماً اگلنے لگا۔ یہی فلسطین کی ولایت اور یہی بحر میت ترکوں کے قبضہ اور حکومت میں پانچسو برس سے زیادہ عرصہ تک رہے مگر ترک اپنی سائنس کی ناواقفیت کی وجہ سے یہ معلوم بھی نہ کر سکے کہ اس بحر میت کے پانی میں دولت کے کیسے کیسے ذخیرے پوشیدہ ہیں۔ ان ذخیروں سے مستفید ہونا تو درکنار کیا اگر ترکوں کو سائنس سے ضروری واقفیت ہوتی تو جو مفاد آج یورپ والے اس بحر میت کے مخفی خزانوں سے حاصل کر رہے ہیں وہ مفاد ترک اپنی پنج صد سالہ حکومت کے دوران میں حاصل نہیں کر سکتے تھے

ناظرین کرام نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی ہوگی کہ عرصہ چند ماہ کا ہوا کہ سلطان ابن سعود والی نجد و حجاز نے حجاز میں کان کنی کا ٹھیکہ ایک انگریزی کمپنی کو عطا کر دیا۔ اس پر ہندوستان کے اکثر اسلامی اخباروں نے مخالفت کی صدا بلند کی کہ سلطان نے اس قسم کا ٹھیکہ ایک غیر مسلم کمپنی کو دے کر صریحاً

نصِ قرآنی کی مخالفت کی۔ کیونکہ ٹھیکہ کے سلسلہ میں کمپنی کے عمال جو غیر مسلم ہیں ارضِ مقدس میں بلا روک ٹوک آمد و رفت رکھیں گے جو اُن اسلامی احکام کے خلاف ہوگا جو اس باب میں آغاز شریعت حقہ سے جاری و ساری ہیں۔

میں سلطان ابن سعود کی طرف سے اُن کے اس فعل کی جوابدہی نہیں کرنا چاہتا نہ میری یہ خواہش ہے کہ انکے اس عمل کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کروں میں اس بارہ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں کان کنی کے متعلق بوجہ مسلمانوں کے علم الارض (Geology) کی ناواقفیت کے ایسی معلومات نہیں ہے جیسی یورپین دنیا میں ہے۔ نہ ایسی کافی و وافی کان کن کمپنیاں موجود ہیں جو یہ کان کنی کا کام جہاں موقع ہو وہاں اپنے ذمہ لے سکیں اسلئے ایک غیر مسلم کمپنی کو موقع مل گیا کہ ارض مقدس میں بھی کان کنی کا کام اپنے ذمے لے لے۔ اسی طرح حجاز میں جو موٹر سروس ہے یعنی اماکن مقدسہ میں جو ایک مقام سے دوسرے مقام کو موٹر کے ذریعہ سفر کا انتظام ہے۔ اس سب کا ٹھیکہ ایک واحد غیر مسلم شخص فلبی نامی کے پاس ہے یعنی موٹر سروس کی جتنی شاخیں ہیں ان سب کا یہی شخص واحد ٹھیکیدار ہے پٹرول (یعنی وہ تیل جو موٹر کے انجن میں استعمال ہوتا ہے) یا ٹیوب اور ٹائر موٹر کے اجزا ہوں یا مجتمع شدہ موٹر کار ان میں سے ہر چیز حجاز میں مسٹر فلبی اور صرف مسٹر فلبی ہی لا سکتا ہے اگر مسٹر فلبی کسی مصلحت سے کسی وقت چاہے کہ موٹر سروس حجاز میں یک قلم بند ہو جائے تو وہ محض پٹرول (تیل) کا لانا بند کر کے حجاز کی ساری موٹر سروس بند کر سکتا ہے۔ سال ڈیڑھ سال کا عرصہ گذرا کہ حجاز اور یمن کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اور اس جنگ میں حجازی افواج کامیابی کے ساتھ

حدود یمن میں داخل ہو گئی تھیں اور یمن کے ایک بہت ہی اہم مقام کی تسخیر میں مصروف تھیں کہ یکا یک یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی کہ بغیر اس اہم مقام کو مسخر کئے ہوئے سلطان ابن سعود نے امام یحییٰ سے صلح کر لی۔ اس وقت یہ بات کچھ ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ سلطان ابن سعود نے ایسا کیوں کیا۔ اس صلح کے کچھ عرصہ بعد ایک حجازی عرب سے جس نے اس صلح کے بعد عرب کو چھوڑا تھا راقم الحروف کو تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ اس حجازی عرب کا بیان ہے کہ اس غیر متوقع صلح کی اصلی وجہ یہ تھی کہ مسٹر فلبی نے پٹرول (تیل) بہم پہنچانا بند کر دیا تھا۔ اسلئے سلطان ابن سعود کی فوج کی موٹر اور لاریاں جہاں تھیں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں لہذا سلطان کو مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ اگر اس حجازی عرب کا یہ بیان صحیح ہے تو کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک خود مختار سلطنت کے ایک پورے محکمہ کا چلنا ایک شخص واحد کی خوشی یا عدم خوشی پر منحصر ہو۔ میرے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ اس حجازی عرب کے اس بیان کی تصدیق یا تردید کر سکوں۔ مگر اس بات کی کہ یہ مسٹر فلبی حجازی موٹر سروس کے جزو کل کا مالک ہے۔ دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق ہوئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت حجاز کی یہ سخت سیاسی غلطی ہے کہ اس نے اپنی مملکت کا ایک بڑا محکمہ (موٹر سروس) ایک شخص واحد کے اختیار میں دے رکھا ہے۔ ایسا اگر نہ بھی کیا ہوتا تو بھی موٹر سروس کا بڑا حصہ ایک شخص نہیں چند اشخاص یا بیرونی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہوتا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موٹر کاریں باہر سے آتیں پٹرول (تیل) باہر سے آتا ٹائر اور ٹیوب باہر سے آتے۔ لہذا ہر صورت میں حجاز کی حکومت اپنی موٹر سروس کے لئے باہر والوں کی (یعنی یورپ اور امریکہ والوں کی) دست نگر ضرور رہتی۔ یہ کیوں؟

یہ محض اسلئے کہ اہل حجاز خصوصاً اور ہم مسلمان عموماً سائنس سے ناواقف ہیں اور اسکے اہل نہیں ہیں کہ سائنٹفک ایجادات کے ذریعہ سے خود اپنی مدد یا اپنے ملک کی حفاظت کرسکیں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ حجاز میں موٹر سروس کے اجراء سے جو روپیہ تمام دنیا کے مسلمان حجاج کی جیبوں سے کرایہ کی صورت میں نکل کر آتا ہے۔اس کا بڑا حصہ مسٹر فلبی اور دیگر یورپین کمپنیوں کی جیبوں میں جاتا ہے اور خود اہل حجاز اس سے مستفید نہیں ہوسکتے۔ بلکہ موٹر سروس کے اجراء سے پہلے یہ کرایہ کا روپیہ جو بدوی اعراب کو ملتا تھا وہ اب اغیار کے پاس پہنچنے لگا ہے۔ بنابراں حجازی عربوں کی عسرت اور فلاکت میں خواہ وہ شہری ہوں یا بدوی معتد بہ اضافہ ہوگیا ہے کہا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی آبادی سلطان ابن سعود کی حکومت کے دوران میں نسبتاً بہت گھٹ گئی ہے اور تنگی اور افلاس کی یہ حالت ہے کہ جب حاجی جدہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں تو جدہ سے مکہ معظمہ تک محتاجین اور مفلوک الحال عرب دورویہ قطار در قطار کھڑے ہوئے ملتے ہیں ۔

موٹر سروس پر کیا موقوف ہے۔ہماری ضرورت کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز ہم مسلمانوں کی سائنس کی ناواقفیت کی وجہ سے ہمارے لئے یورپ امریکہ اور جاپان سے بنکر آتی ہے۔ ہم اپنی گاڑھی کمائی کے روپوں سے اسکو خریدتے ہیں اور وہ ہمارے روپے اغیار کی جیبوں میں جاتے ہیں ۔

ہندوستان اپنے مختلف حصص کے لحاظ سے ایک معتدل یا گرم ملک ہے اور اکثر ممالک اسلامی بھی ہندوستان کی طرح معتدل یا گرم ہیں ان مقامات میں برف کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن برف بنانے کی مشینیں یا کلیں یورپ

اور امریکہ والے بوجہ اپنی سائنسدانی کے ایجاد کرتے ہیں۔ یہ کلیں ہندوستان اور اسلامی ممالک میں ہزاروں لاکھوں روپے کے بالعوض آتی ہیں۔ ان مشینوں کے ذریعہ برف بنایا جاتا ہے اور کم از کم شہری آبادی میں سے قریب قریب ہر شخص اسکو استعمال کرتا ہے۔ کیا یہ تعجب اور افسوس کی بات نہیں کہ جن ممالک میں برف کی سب سے زیادہ ضرورت ہو وہ تو برف بنانے کی کلیں ایجاد نہ کرسکیں بلکہ وہ ممالک جن میں برف کے استعمال کی ضرورت نہیں ہے یا ہے تو بہت ہی کم وہ ان کلوں کے موجد ہوں

آجکل بجلی کی قوت کی ایجاد سے دنیا کے کسقدر کام چلتے ہیں اکثر شہروں میں اب روشنی اسی کے ذریعہ سے ہوتی ہے پنکھے اسی کے ذریعہ سے چلتے ہیں۔ موٹر کاریں موٹر بسیں اسی کے ذریعہ سے چلتی ہیں۔

غرض یہ کہ ہماری روزانہ زندگی کی بہت سی ضرورتیں اسی کے ذریعہ سے پوری ہوتی ہیں۔ لیکن ہم مسلمان ہیں کہ ہمارے لئے اسکا موجد ہونا تو درکنار ہم اس ایجاد شدہ طاقت سے مستفید ہونا بھی نہیں جانتے۔

یورپ اور امریکہ میں جتنا غلہ ایک کاشتکار اپنی سائنٹفک معلومات کی وجہ سے ایک ایکڑ زمین سے پیدا کرلیتا ہے۔ اتنا غلہ ہم ہندوستانی چار پانچ ایکڑ زمین سے بمشکل پیدا کرسکتے ہیں اور ہندوستانی کاشتکاروں میں مسلمان کاشتکاروں کی حالت اور بھی زبون ہے

ہندوستان کے دیگر صوبوں کا حال تو مجھکو زیادہ معلوم نہیں مگر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی بابت اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس صوبہ میں زمین کا اوسط فی کاشتکار دو ایکڑ سے زیادہ کسی طرح نہیں پڑتا اور صوبے کے مشرقی اضلاع میں تو اوسط فی کاشتکار دو ایکڑ سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے کہ دو ایکڑ زمین کی پیداوار سے ایک کاشتکار اپنے موجودہ طریقہ کاشت

کے ذریعہ سے اپنا اور اپنے لواحقین کا پیٹ نہیں پال سکتا۔ نیز اگر نئے اور سائنٹفک طریقہ کاشت کے اختیار کرنے کی وجہ سے اس کاشتکار کی زمین کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہو جاوے تو اس کاشتکار اور اسکے متعلقین کو کسقدر نفع پہنچ سکتا ہے کیا ہندوستان کے کاشتکار اور ان میں سے مسلمان کاشتکاری پیشہ لوگ اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ سائنٹفک معلومات انہیں عام کر دی جائے تاکہ وہ اپنا اور اپنے معصوم بچوں کا بسہولت پیٹ پال سکیں۔ کیا یہ ملک اور قوم کی بڑی خدمت نہ ہوگی اگر ایسی تعلیم اور ایسی معلومات کاشتکاروں میں عام کر دی جاوے۔

الحاصل سائنس کے ذریعہ سے کسب معاش کے نئے نئے دروازے ہمارے لئے کھلتے ہیں اور پرانے دروازے اور زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ لہذا ہر اس شخص کو جسکے دل پر مسلمانوں کی موجودہ نکبت و فلاکت سے چوٹ لگتی ہے ہر امکانی کوشش کرنا چاہئے کہ مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم عام ہو جاوے تاکہ کچھ تو انکی موجودہ نکبت و فلاکت دور ہو سکے

ممکن ہے کہ میرے مندرجہ بالا معروضات کے جواب میں بعض حضرات کیطرف سے یہ فرمایا جاوے کہ تم نے جو کچھ اوپر کہا وہ محض دولت کمانے کی تدابیر سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمانوں کو دولت کی حاجت ہی کیا ہے۔ مسلمان دولت دنیا کے طالب نہیں ہیں مسلمانوں کے لئے آخرت بس ہے۔ اسکے جواب میں صرف اسقدر گذارش ہے کہ کسی قوم کے دولت کمانے کی تدابیر اختیار کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان میں سے ہر فرد قارون بن جاوے۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ قوم ایسی تدابیر اختیار کرے کہ اس کے سب افراد نہیں تو کم از کم اکثر افراد اسقدر کما سکیں کہ اغیار کے شرمندۂ احسان ہوئے بغیر وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی روزی کے کفیل ہو سکیں۔

مسلمانوں کی اقتصادی غلامی

کیا آپکو اس بات کا اندازہ ہے کہ فی زمانہ ہندوستان کے عام مسلمان اپنی گردنیں اغیار کی غلامی میں دئیے بغیر کہانتک اپنے اور اپنے بچوں کیلئے قوت لایموت حاصل کرسکتے ہیں مسلمان دستکار ہوں یا تجارت پیشہ کاشتکار ہوں یا زمیندار سب ہندو مہاجنوں اور ساہوکاروں کے پنجۂ ظلم وستم میں گرفتار ہیں اور سب کی گردنیں ان مہاجنوں کے قرضہ کے بار سے دبی ہوئی ہیں۔ مجھکو محکمہ امداد باہمی کے تعلق کیوجہ سے چندسال تک لکھنؤ میں قیام کا اتفاق ہوا لکھنؤ میں زردوز، چکن ساز، گوٹہ باف غرضیکہ زیادہ تر دستکار لوگ سب مسلمان ہیں مگر "الشاذ کالمعدوم" کو چھوڑکر ان دستکاروں میں کسی کے پاس اپنے پیشہ کا کام چلانے کیلئے کم سے کم بھی سرمایہ نہیں ہوتا۔ اسلئے انمیں سے سب نہیں توکم از کم بچانو فیصدی ضرور ہندو مہاجنوں اور دوکانداروں سے چھتیس ۳۶ فیصدی اور اس سے بھی گراں سود پر قرض لیکر اپنے پیشہ کا کام چلاتے ہیں جسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ دستکار نے کام شروع کرنے سے پیشتر حسب حیثیت روپیہ ہندو دوکاندار سے قرض لیا اس روپے سے اس نے سوت، کلابتوں وغیرہ خریدا یا دوکاندار سے ہی سوت، کلابتوں نقد روپیہ کی جگہ قرض لیا۔ چکن، گوٹہ یا زردوزی کا کام تیار کیا اور حسب معاہدہ طیار شدہ مال ہندو دوکاندار کی دوکان پر پہنچادیا، دوکاندار نے اسکو اپنی سہولت کے مطابق خاطرخواہ نفع پر فروخت کیا، اس قرض اور سود کی ادائیگی کے بعد دستکار کو تین یا چار آنہ یومیہ سے زائد مزدوری کبھی نہیں ملی اور مہاجن کے قرضہ میں اسکی گردن ساری عمر پھنسی رہی۔ اس قرضہ کی غلامی سے ان دستکاروں کو عمر بھر کبھی آزادی نہیں ملتی

جو در اصل زرخرید باندی غلام ہیں انکو بیسیوں مواقع اپنی آزادی حاصل کرنے کیلئے میسر ہیں مگر اس قرض کی غلامی سے ان آزاد دستکاروں کی گردنیں کبھی خلاصی حاصل نہیں کر سکتیں

اسی طرح مسلمان کاشتکار بھی ہندو مہاجنوں اور ہندو زمینداروں کے قرضہ کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور ان کی بھی اس بار سے تمام عمر گلوخلاصی نہیں ہوتی

کیا آپ نے کبھی اس بات پر توجہ کی کہ ان بے دست و پا دستکاروں اور کاشتکاروں کو ان ہندو مہاجنوں اور ساہوکاروں کی غلامی سے کیونکر نجات دلائی جائے جو تدابیر میں نے اوپر عرض کی ہیں اگر ان سب کو اختیار کر لیا جاوے تو اسکا نتیجہ کم از کم یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مسلمان دستکار اور عوام ایک حد تک اغیار کی غلامی سے نجات پا جادیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا مقصد ہے کہ اسکو کسی نقطۂ نظر سے مذموم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

رہا یہ کہنا کہ مسلمانوں کو روپیہ یا سرمایہ کی ضرورت ہی نہیں تو اسکے متعلق محض یہ عرض ہے کہ اگر انصاف سے دیکھا جاوے تو مسلمانوں کو روپے اور سرمایہ کی دیگر مذاہب کے پیروؤں کی بہ نسبت غالباً زیادہ ضرورت ہے۔

عیسائیوں میں رہبانیت اور ترک تعلقات دنیوی ایک ممدوح فعل ہے چنانچہ عیسائیوں میں بعض مذہبی افراد مثل مانک (Monk) اور نن (Nun) کے تجرد کی قسم کھا لیتے ہیں اور کبھی شادی نہیں کرتے اسی طرح ہندوؤں میں ایک شخص سادھو اور بدھ مذہب والوں میں بھکشو ہوکر علائق دنیا کو منقطع کر سکتا ہے لیکن ایک مسلمان کیلئے نکاح کرنا ہر حالت میں سنت ہے اور اکثر حالتوں میں واجب۔ جب ایک مسلمان نکاح کریگا اور دنیا کے علائق پیدا ہونگے تو اس پر اپنے متعلقین کی کفالت واجب ہوگی جسکے لئے روپیہ سرمایہ اور اکل حلال کی ضرورت ہوگی اور سائنس اور اسکے معلومات اس اکل حلال حاصل کرنے میں ہماری بڑی حد

تک مدد کر سکتے ہیں اور اغیار کی سرمایہ داری کی غلامی سے ایک حد تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

جنگ اور سائنس

علاوہ کسب معاش میں محمد ہونیکے سائنس بڑی حد تک جنگ میں بھی اقوام عالم کی معاون بن سکتی ہے اس سے غالباً کسی شخص کو انکار نہ ہوگا کہ آجکل کوئی قوم کامیابی کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتی جبتک کہ وہ سائنٹفک آلات حرب سے آراستہ وپیراستہ نہ ہو اور ان آلات جنگ سے وہ اسوقت تک آراستہ نہیں ہوسکتی جب تک کہ اسمیں سائنس کی تعلیم عام نہ ہو اور اسکے افراد کا ایک معقول حصہ اعلیٰ درجہ کا سائنسداں نہ ہو۔ تاکہ اگر کوئی شخص نیا آلۂ جنگ تیار کرے تو اس قوم کے افراد فوراً اسکا کامیاب دفاع کر سکیں۔ اسلئے سائنسدانی کامیابی کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بھی ناگزیر ہے ممکن ہے یہاں بعض حضرات کو شبہ ہو کہ تم اسباب کی طرف دیکھتے ہو اور ہم مسبب کیطرف مگر میں عرض کروں گا کہ حضور پرنور اور صحابہ کرام سے زیادہ کوئی مسبب کو دیکھنے والا نہیں ہوسکتا۔ مگر خود حضور اور آپ کے صحابہ کرام نے بھی کبھی اسباب کو نظر انداز نہیں کیا۔ ہجرت سے پہلے اور بعثت کے بعد مکہ معظمہ میں کفار مسلمانوں پر کیا کچھ مظالم نہیں کرتے تھے۔ اور خود ذات اقدس کے ساتھ کیا کچھ گستاخیاں اور بے ادبیاں نہیں کیجاتی تھیں اور ایذائیں نہیں پہنچائی جاتی تھیں مگر چونکہ ابتدا میں مکہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور قوت کمزور یعنی مسلمانوں کے پاس اسباب مدافعت موجود نہیں تھے، اسلئے حضور نے مسلمانوں کو کبھی حکم نہیں دیا کہ کفار کے ظلم و زیادتی کا ترکی بہ ترکی جواب دیں بلکہ مسلمانوں کو اس وقت یہی ہدایت تھی کہ کفار کے مظالم کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کریں بلکہ یہاں تک اجازت دیدی گئی تھی کہ اگر جان جانیکا اندیشہ ہو اور کفار کسی مجبور مسلمان کو کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کریں اور وہ مسلمان

کلمۂ کفر کہکر اپنی جان بچائے تو بھی گنہگار نہ ہوگا۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا اور اسباب ظاہری انکے پاس (گو کفّار کے مقابلہ میں بہت کم ہی سہی) جمع ہوگئے تب آیات جہاد اتریں اور مسلمانوں کو حفاظت خود اختیاری کیلئے اور کفّار کے فتنہ اور فساد کو دور کرنے کے لئے جہاد کی اجازت ملی۔ لہٰذا اگر مسلمان حضور کے زمانہ میں اسباب ظاہری سے مستغنی نہیں تھے تو اب کیسے ہوسکتے ہیں؟ اگر مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ دوسروں کے محکوم بنکر ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں اگر ان میں اعلاء کلمۃ الحق کا کچھ بھی ولولہ باقی ہے تو ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ سائنٹفک تعلیم حاصل کریں۔ اور سائنٹفک معلومات کے ذریعہ سے اپنے کو اس قابل بنادیں کہ اگر اغیار سائنٹفک آلات حرب سے مسلح ہوکر ان پر حملہ آور ہوں تو وہ کم از کم انھیں کے جیسے آلات حرب سے مسلح ہوکر انکی مدافعت کرسکیں۔ میری ان گذارشات سے ناظرین کرام کو معلوم ہوگا کہ فی زمانہ زندگی کے ہر شعبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کیلئے ہم کو قدم قدم پر سائنس اور اسکی معلومات کی ضرورت ہے اسی لئے میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔ اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ تمام بہی خواہانِ اسلام بالخصوص علماء کرام اسطرف توجہ فرمائیں اور مسلمانوں کو ہر امکانی کوشش سے سائنس کی طرف متوجہ کریں اور خود عربی مدارس میں سائنس کی تعلیم کا اجرا کرکے اپنی طرف سے اچھی مثال قائم فرمادیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

قسط چہارم

اس مضمون کی گذشتہ تین قسطوں میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ علماء کے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم کی طرف سے اجتناب پیدا ہوا۔ اس قسط میں میں اپنے اس

بیان کی کسیقدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں ایسا کرنے کے یہ عرض کردینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ ایسا کرنے سے میرا مقصد ہرگز کسی گروہ کی تنقیص کرنا نہیں ہے اگر کوئی مقصد ہے تو صرف اسقدر کہ اگر مسلمانوں کو کسی گروہ کے عمل یا رویہ سے نقصان پہنچا ہے تو اس نقصان کی طرف مؤدبانہ اس گروہ کی توجہ دلائی جاوے اور حتی الامکان اسکی تلافی کی کوشش کیجاوے

راقم الحروف کا خیال ہے کہ پچھلی تین چار صدیوں کے دوران میں علماء کے عمل۔ اثر اور رویہ سے مسلمانوں میں سائنٹفک تعلیم کیطرف سے اجتناب پیدا ہوا۔ اور مسلمان سائنٹفک تعلیم سے محروم رہے جسکا نتیجہ ہے کہ مسلمان سائنٹفک تحقیقات کے میدان میں قریب قریب تمام اقوام عالم سے پیچھے ہیں اور موجودہ ایجادات میں سے کسی ایجاد کے موجد ہونیکا فخر انھیں حاصل نہیں ہے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے آنے سے اور نئے طریقۂ تعلیم کے اجراء سے پیشتر ہماری تعلیم کے واحد کفیل اگر کوئی ادارے تھے تو ہمارے عربی مدارس ہی تھے ان مدارس میں طالبعلم نہ صرف ہندوستان کے ہر گوشہ سے اپنی علمی پیاس بجھانے کیلئے آتے تھے بلکہ بیرونی ممالک مثل افغانستان اور بخارا سے بھی طالبعلم ہندوستان کے بحر علم سے سیراب ہونیکے لئے جوق جوق چلے آتے تھے اسیطرح ممالک اسلامی میں جو عربی مدارس مثل جامع ازہر کے تھے وہ بھی دور دور سے تشنہ کامان علم کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اب اگر ان عربی مدارس کی تعلیم ایسی تھی کہ وہ اپنے طلاب میں آزادانہ علمی اور سائنٹفک تحقیقات کی روح پھونکتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم مسلمانوں میں بھی ان پچھلی تین چار صدیوں میں متعدد نیوٹن (Newton) اور مارکنی پیدا ہوتے اور مختلف علمی اور سائنٹفک ایجادات کے موجد ہونیکا سہرا ہم مسلمانوں کے سر رہتا لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا تو بظاہر اسباب ماننا پڑیگا کہ ہماری تعلیم ہی میں نقص

تھا کہ ہم میں ایسے افراد نہیں پیدا ہو سکے۔ ذیل کی مثالوں سے عربی مدارس کے نصاب تعلیم کے ناقص یا عدم ناقص ہونیکی بابت ناظرین خود رائے قائم فرما سکیں گے۔

(۱) میرے ایک استاد ہیں جو نہایت نیک اور بزرگ ہیں جنکا میں نہایت ادب کرتا ہوں اور جو عربی مدارس کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں جب بلقان کی لڑائی ہو رہی تھی اسوقت اخباروں میں لڑائی کی خبروں میں قسطنطنیہ کا نام اکثر آتا تھا مولانا سے پوچھا گیا کہ قسطنطنیہ کہاں ہے تو مولانا کو ٹھیک پتہ نہیں تھا کہ قسطنطنیہ کس براعظم میں ہے اور ہندوستان کے کس سمت میں واقع ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مولانا صاحب سے جو فارغ التحصیل ہیں اور نہایت ذہین اور اچھے خاصے مناظر ہیں حال ہی میں گفتگو ہوئی ان صاحب کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ ملک یمن کس طرف ہے باوجودیکہ یہ وہ ملک ہے۔ جسکا ذکر احادیث صحیحہ میں اور جا بجا اسلامی تاریخوں میں آتا ہے۔ میرے خیال میں اگر قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کا حکم نہ ہوتا تو غالباً ہمارے یہاں کے عربی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات میں سے اکثر کو یہ بھی علم نہ ہوتا کہ مکہ معظمہ یہاں سے مشرق میں ہے یا مغرب میں اسیطرح ان دوسرے بزرگ سے اس بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ زراعت اگر نئے سائنٹیفک طریقہ سے کیجائے تو زمین کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ مولانا مذکور الصدر نے دریافت فرمایا کہ اب کیوں زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنیکی ضرورت پڑی پہلے اسکی ضرورت کیوں نہیں پڑتی تھی میں نے عرض کیا کہ اب دنیا کی آبادی بڑھ گئی ہے اور زمین اسی قدر ہے اسلئے اب اس کی ضرورت ہے کہ تھوڑی زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کیجائے۔ اس پر مولانا بیساختہ فرماتے ہیں کہ کیا دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے جب میں نے انکی اس ناواقفیت پر اظہار استعجاب کیا تو وہ اپنی مناظرانہ افتاد طبیعت کے مطابق

فرمانے لگے کہ شخص ہر علم کا ماہر نہیں ہو سکتا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ ہمارے عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو ایسی سطحی باتوں سے ناواقفیت ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ اسکا بالکل احساس ہی نہیں کہ ہماری یہ عدم واقفیت کسی طرح قابل گرفت یا قابل الزام ہے یا یہ کہ کسی ادارے کے ایک فارغ التحصیل طالبعلم کیلئے یہ کچھ شرم کی بات ہے یا نہیں کہ انکو علوم حاضرہ متداولہ سے اسقدر واقفیت نہو کہ وہ یہ جانیں کہ قسطنطنیہ کہاں ہے یا یہ کہ دنیا کی آبادی گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے جو نصاب تعلیم ایسا ہو کہ اسکے فارغ التحصیل بزرگوں اور طلباء سے ایسی سطحی باتوں سے ناواقفیت کا اظہار رہو۔ اسکا ناقص ہونا اظہر من الشمس ہے مگر اس ناواقفیت پر ان دونوں صاحبوں کو ذاتی طور پر قابل الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا قابل الزام اگر ہے تو وہ نصاب تعلیم ہے جس نے ان کی معلومات کا دائرہ اسقدر محدود رکھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہر طالبعلم جملہ علوم وفنون کا ماہر نہیں بن سکتا مگر ہر درسگاہ میں جسکی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسمیں تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ ہر طالبعلم کو معمولی علوم حاضرہ متداولہ ایک حدتک ضرور پڑھائے جاتے ہیں۔ اس حدتک ان علوم کو پڑھنے کے بعد طالبعلم کو اختیار ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ علم کو خاص طور پر سیکھے اور اسمیں یا ان میں ماہر فن بننے کی کوشش کرے۔ عربی مدارس کا کچھ عجیب اسلوب ہے کہ علوم دینیہ کو چھوڑ کر دنیاوی ضرورتوں کیلئے جتنے مفید علوم ہیں مثلاً حساب۔ اقلیدس۔ جبر مقابلہ۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ سائنس جدید ہر ایک سے تقریباً کلی اجتناب کیا گیا ہے۔ البتہ منطق اور فلسفہ قدیم پر اس سے بھی زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے۔ جتنا کہ بعض ضروری دینی علوم پر۔ اور قدیم فلسفہ میں بھی علم ہیئت کو جو نسبتاً کارآمد چیز ہے اور

جسمیں تحقیق و تدقیق اسکے طلباء کو جدید علم ہئیت کیطرف غالباً لیجانی اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے
میری اطلاع یہ ہے کہ منطق اور قدیم فلسفہ پر ایک اچھے ذہن طالبعلم کو کم از کم
تین سال صرف کرنا پڑتے ہیں برخلاف اسکے ایسے ضروری دینی علوم پر جیسے تفسیر اور
حدیث جو آخر میں پڑھائے جاتے ہیں طالبعلم کا نسبتاً بہت کم وقت صرف کرایا جاتا ہے
کیا علماء کرام یا عربی مدارس کے ارباب حل وعقد کوئی وجہ بتا سکتے ہیں کہ عربی مدارس
کی تعلیم میں منطق اور قدیم فلسفہ کی تعلیم پر کیوں اسقدر زور دیا جاتا ہے اور دیگر
ضروری علوم مثل ریاضی ۔ تاریخ ۔ جغرافیہ ۔ جدید سائنس جو دنیاوی نقطۂ نظر سے
ہمارے لئے نہایت ضروری اور جن کے بغیر ہم اپنی روزمرہ کی دنیاوی ضرورتوں
کو کسی طرح پورا نہیں کر سکتے قریب قریب بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے ۔

کیا جو وقت طالبعلموں کا منطق اور فلسفہ کے پڑھنے اور استادوں کا ان علوم
کو پڑھانے میں صرف ہوتا ہے وہ بالکل تضیع اوقات نہیں ہے اگر ہے تو سالہا
سال سے کیوں علماء نے اپنی اور طلباء کی اس تضیع اوقات کو جائز رکھا ۔ انگریزی
میں منطق کو (Logic) کہتے ہیں اور لاجک (منطق) کی عقلاء یورپ کے خیال
کے مطابق دو قسمیں ہیں ۔ یعنی

(۱) ڈیڈکیٹو لاجک (Dedective Logic) یعنی استدلال کا
وہ علم جو ہم کو دیئے ہوئے قضیوں سے صحیح نتائج نکالنا سکھلاتا ہے ۔

(۲) انڈکیٹو لاجک (Inductive Logic) یعنی وہ علم
جو ان دیئے ہوئے قضیوں کی صحت اور عدم صحت سے بحث کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ
منطق کی پہلی صنف ہمکو محض صحیح استدلال کا طریقہ سکھلاتی ہے ۔ ہماری معلومات میں

اسکے ذریعہ سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے، منطق کی دوسری صنف اللتہ ایسی چیز ہے جسکے ذریعہ سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ جہاں تک میری اطلاع ہے ہمارے عربی مدارس میں منطق کی صرف پہلی صنف (Dedective Logic) ہی پڑھائی جاتی ہے۔ اگر یہ میری اطلاع صحیح ہے تو ہماری بدقسمتی سے ہمارے علماء نے منطق کے درس وتدریس میں بھی اس کا وہ جز داختیار کیا جو ہم کو استدلال کی بھول بھلیوں میں تو گرفتار رکھے مگر معلومات میں کچھ اضافہ نہ کرسکے۔

کیا اب علماء کو اور عربی مدارس کے ارباب نظم ونسق کو اس بات کا احساس و اعتراف ہے کہ عربی مدارس کے طلباء کا جو وقت منطق اور فلسفہ قدیم کی تعلیم اور حصول میں صرف ہوتا ہے وہ اگر علوم ریاضی۔ جغرافیہ۔ تاریخ اور جدید سائنس کی تعلیم اور حصول میں صرف ہوتا تو وہ ان طالبعلموں کیلئے خصوصاً اور مسلمانوں کیلئے عموماً بہت زیادہ مفید ثابت ہوتا اگر ہے تو اس احساس کو عمل کا جامہ کیوں نہیں پہنایا جاتا اور جو جمود کی کیفیت عربی مدارس کی تعلیم پر طاری ہے وہ کیوں نہیں دور کیجاتی۔ کسی طریقہ تعلیم یا نصاب تعلیم کے مفید یا غیر مفید ہونے کی سب سے بہتر جانچ اس کے نتائج سے ہوسکتی ہے یعنی دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے عربی مدارس پچھلی تین چار صدیوں میں کسقدر ماہرین فنون اور محققین پیدا کرسکے۔

شارع اسلام نے نص قرآنی اکملت لکم دینکم کے ذریعہ سے اپنے زمانہ مبارک ہی میں شریعت حقہ کی تکمیل ہمارے واسطے فرمادی تھی۔

صحابہ کرام نے ہمارے واسطے جمع قرآن کی خدمت انجام دی۔ تابعین اور تبع تابعین نے دور و دراز کے سفر کرکے اور سخت محنت اور جانفشانی کے بعد

جمع حدیث کا کام ہمارے لئے باحسن الوجوہ انجام دیا۔

یہ بزرگ گھر اور مسجد کے حجروں میں بیٹھکر حدیثیں نہیں جمع کرتے تھے بلکہ ایک ایک حدیث کے جمع کرنے کیلئے ان کو دور و دراز کے سفر اختیار کرنا پڑتے تھے۔ پھر یہ بزرگ اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ کسی شخص سے کوئی حدیث سنی اور اس کو لکھ لیا۔ بلکہ کاوش کے ساتھ ہر راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ سچا اور جھوٹا ہونیکی جانچ اور تحقیقات فرماتے تھے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جمع حدیث کے ساتھ ساتھ ایک مستقل علم یعنی علم الرجال کی بنیاد پڑ گئی۔ ائمہ اربعہ نے اور دیگر بزرگان سلف نے علم فقہ تفسیر اور اصول کو ہمارے لئے مدون کیا اور ان علوم میں ان کی تصانیف ہمارے لئے آج تک شمع ہدایت ہیں۔

ان علمی خدمات کے ساتھ ساتھ ہمارے اسلاف نے جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ کی خدمت بھی اس ایثار تندہی اور بے لوثی کے ساتھ انجام دی کہ ہجرت نبوی سے ایک صدی کے اندر اندر اسلام کا پھریرا چار دانگ عالم پر لہرانے لگا اور مسلمان لغوی معنی میں خدا کی زمین کے وارث بن گئے۔ اور نص قرآنی یعنی ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ؕ کا منشا پورا ہوا۔

ہمارے اسلاف کی ان دینی خدمتوں نے ہم کو علم دین کے جمع اور احصار کی طرف سے بڑی حد تک مستغنی کر دیا تھا اور اسلامی قوت کے عام غلبہ نے دنیا کا گوشہ گوشہ ہمارے لئے وا کر دیا تھا ہمارے لئے پورے مواقع حاصل تھے کہ ہم ہر قسم کے علوم و حکم کی تحقیق و تدقیق کرتے اور جہاں کہیں کوئی نئی حکمت کی بات ملتی اسکو گرہ باندھتے اور فرمان واجب الاذعان اعنی اطلبوا العلم ولو کان بالصین، کی پوری تعمیل

کرتے اور نئے نئے علمی انکشافات اور سائنٹفک ایجادات کے ذریعہ سے دنیا کے ذخیرۂ معلومات میں اضافہ کرتے اور خود اپنی اور تمام بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود کا باعث بنتے اور ان ایجادات کے ذریعہ سے ہر قسم کی انسانی ضرورتوں کو پورا کرتے اور خلق خدا کیلئے نیا نیا سامان آرام وآسائش فراہم کرتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے ان امیدوں کو کہاں تک پورا کیا۔ لہذا ہم کو اس بات کا جائزہ لینا چاہیئے کہ پچھلی چند صدیوں میں ہم نے اپنے علمی اور سائنٹفک تحقیقات کے ذریعہ سے اپنی دینی یا دنیاوی معلومات میں کیا کیا اضافہ کیا یا برخلاف اس کے ترقی معکوس کی۔ میں اس کا اہل نہیں ہوں لیکن اگر کوئی بزرگ جو اس کے اہل ہوں مسلمانوں کی علمی ترقی اور تنزل کی تاریخ لکھیں اور مسلمانوں کی علمی اور سائنٹیفک معلومات اور اہم تصنیفات کی خواہ وہ دینی معلومات سے تعلق رکھتی ہوں یا دنیوی ایک صدی وار فہرست مرتب کریں تو یہ تاریخ اور یہ فہرست نہایت دلچسپ اور کارآمد ثابت ہوگی۔ جناب مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرزاپوری نے اپنے مضمون تاریخ میلاد میں بیحد تلاش اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ لیکن اگر مولانا موصوف اتنی ہی محنت اور کاوش مسلمانوں کی علمی ترقی اور تنزل کی تاریخ لکھنے میں صرف کرتے تو نتیجہ بہت زیادہ مفید اور کارآمد ہوتا۔ کیا یہ امید کیجاوے کہ مولانا موصوف ایسی تاریخ لکھنے کی تکلیف گوارہ فرماویں گے۔ دوسرے بزرگ جو سب سے زیادہ اس کام کے اہل ہیں وہ مولانا سید سلیمان ندوی ہیں وہ اگر اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو وہ اسکو باحسن الوجوہ انجام کو پہنچا سکتے ہیں اگر ایسی تاریخ لکھی جاوے اور ایسی فہرست مرتب کیجاوے تو ہر شخص پر عیاں ہو جائے گا کہ ہم مسلمان کس سرعت کے ساتھ انحطاط اور زوال کی طرف جارہے ہیں۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کی علمی اور سائنٹفک تحقیقات گذشتہ دو تین صدی کے اندر بمقابلہ اکثر دیگر اقوام عالم کے بمنزلہ صفر کے ہے مسلمہ طور پر سائنٹفک معلومات اور ایجادات میں تو ہمارا کوئی حصہ ہے ہی نہیں۔ دیگر علوم عقلیہ مثل ہندسہ۔ ریاضی ہیئت میں بھی دنیا کی معلومات میں ہم مسلمانوں کی طرف سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

مگر سخت حیرت اور استعجاب کی تو یہ بات ہے کہ خالص دینی معلومات اور دینی تصنیفات میں بھی ہم مسلمانوں کے کارنامے پچھلی دو تین صدی کے اندر مقابلتاً نہیں بلکہ مطلقاً بھی بمنزلہ نفی کے ہیں۔ دینی تعلیم اور دینی معلومات میں بھی جو ہمارے مایۂ ناز ہیں اور جن پر ہم کو بہت فخر و مباہات ہے ہم یورپ کا مقابلہ کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اعلیٰ درجہ کی محققانہ دینی تصنیفات جتنی یورپ میں ایک سال کے اندر وجود میں آجاتی ہیں۔ ہمارے یہاں ایک صد سال میں بھی وجود میں نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر میں صرف ایک کتاب یعنی گاڈ اینڈ دی ایسٹرانومرس (God and the Astronomers) جو حال ہی میں چھپی ہے اور جو مجموعہ ان خطبوں کا ہے۔ جو ڈین اینج نے ۱۹۳۳ء کے درمیان دیئے تھے۔ تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک خالص مذہبی کتاب ہے اور ایک پادری ڈین اینج کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکے گا کہ عیسائیوں کے علماء اور مذہبی پیشوا دینی اور دنیاوی معلومات میں کیا پایہ رکھتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوگا کہ اس کتاب کے مصنف کو فلسفہ قدیم فلسفہ جدید اور آخر سے آخر سائنٹفک معلومات پر کسقدر عبور ہے علماء میں سے جو بزرگ انگریزی داں ہوں گے وہ میرے اس بیان کی تصدیق فرما سکیں گے۔ مگر

مقابلہ کو نظر انداز کرکے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہم نے مطلقاً بھی اس دینی سرمایہ میں جو ہم کو ہمارے اسلاف سے ملا تھا کچھ اضافہ کیا ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں میں کسی وسعت نظر کا مدعی نہیں ہوں۔ مگر جہانتک میرا علم ہے پچھلی دو تین صدی کے اندر ہم مسلمان سوائے ایک کے اور وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب حجتہ اللہ البالغہ ہے کوئی تصنیف بھی ایسی پیش نہیں کرسکتے۔ جو امام غزالی کے احیاء العلوم کے پایہ بپایہ رکھی جاسکے نہ علم تفسیر میں ہم کوئی تصنیف ایسی پیش کرسکتے ہیں جو اس قابل ہو کہ اسکو تفسیر کبیر یا تفسیر کشاف کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکے یہی حال تصوف کا ہے۔ پندنامہ فریدالدین عطار یا مثنوی مولانا روم کے پایہ کی کوئی کتاب پچھلی دو تین صدی میں وجود میں نہیں آئی علوم دین کی کسی اور شاخ میں بھی متاخرین کی کوئی محققانہ تصنیف میرے علم میں ایسی نہیں ہے جو ہدایہ اور شرح وقایہ کی قائم مقامی کرسکے تبلیغی حیثیت سے بھی ہمارے علماء نے کوئی ایسی تصنیف دنیا کے سامنے پیش نہیں کی، جو غیر اسلامی ممالک میں اسلام کی نشر و اشاعت کا سبب بن سکتی جسٹس امیر علی کی پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam by Justice Amir Ali) غالباً ایک مسلمان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اور اشاعت اسلام کی بابت کچھ معلومات یورپ والوں تک پہنچی۔ ہمارے علماء نے تو اس بات کی تکلیف بھی گوارا نہیں فرمائی کہ کلام پاک کا ترجمہ یورپ اور دیگر غیر اسلامی ممالک کی مختلف زبانوں میں کرکے خدا کا پیغام غیر مسلمین تک پہنچاتے انگریزی زبان میں مسلمان کا کیا ہوا کلام پاک کا صرف ایک ترجمہ ہے جس سے میں واقف ہوں۔ اور وہ لاہور کے مولانا محمد علی کا ہے۔ مگر وہ قادیانی طبقہ کے لوگوں میں سے

سمجھے جاتے ہیں۔ اب حال میں علامہ عبداللہ ابن یوسف علی کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ صاحب نئے تعلیم یافتہ گروہ میں سے ہیں یہ نہیں معلوم کہ ان کا ترجمہ علماء کے گروہ میں مقبول بھی ہوگا۔ حال میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ فرما رہے ہیں یہ ہر دو صاحب خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ابتک علماء نے اس ضروری دینی خدمت کو کیوں نہیں سرانجام دیا۔ ان پچھلی دو تین صدیوں کے دوران میں ہماری ذہنی جودت زیادہ تر اس بات پر محدود رہی کہ ہم متقدمین کی کتابوں پر۔۔۔۔۔۔ حاشیہ در حاشیہ لکھیں مگر اپنے ذہن کیلئے کوئی نیا جادہ عمل تلاش نہ کریں محض پرانی لکیر کے فقیر بنے رہیں

ان حالات پر غور کرنے سے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان پچھلی دو تین صدیوں میں ہماری اس علمی بے مائیگی کا سبب کیا ہے اس کا سب سے بڑا سبب تو اوّل ہمارے عربی مدارس کا نصاب تعلیم معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہمارا غیر ضروری اور جزئی اختلافی مسائل میں انہماک۔ ہمارے علماء اپنی ساری ذہنی قوت اور جودت انھیں اختلافی مسائل کے مباحث میں صرف کر دیتے ہیں جسکے بعد ان کے پاس اول تو اتنا وقت ہی نہیں رہتا کہ وہ اس کو علمی اور سائنٹفک تحقیقات میں صرف کرسکیں دوسرے یہ کہ جب عادت جزئی مسائل پر بحث کرنیکی پڑ جاتی ہے تو تحقیق مسائل پر غور کرنیکی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔

عربی مدارس کے نصاب پر میں اس سے پہلے کچھ روشنی ڈال چکا ہوں اب صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ جو نصاب اور طریقۂ تعلیم اپنے طلّاب سے ریاضی جیسے ضروری

علم اور جملہ ایسے علوم کی تعلیم سے جیسے کہ طبیعیات وغیرہ جنکی تصدیق یا تردید مشاہدات سے ہوسکتی ہے۔ اور نیز ایسے علوم جیسے تاریخ وجغرافیہ جو اپنے طالبین کی نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں پرہیز کرتا ہے۔ اور عقلی علوم میں ان کی تعلیم محض منطق اور فلسفہ قدیم تک محدود رکھتا ہے جنکو کوئی تعلق مشاہدات سے نہیں ہے۔ تو اسکا قدرتی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسے متعلمین کو تجربہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور جو معلومات تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہیں ان سے وہ ہمیشہ کیلئے محروم رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دنیا کی معلومات کا سب سے بہتر اور سب سے بڑا ذریعہ ہمارے لئے تجربہ اور مشاہدہ ہی ہے۔ یہ ہے ہمارے عربی مدارس کے نصاب کا سب سے بڑا نقص۔ اور اس انکشاف کے بعد یہ معمہ کہ ہمارے عربی مدارس کے تعلیم یافتہ اصحاب علوم عقلیہ اور سائنٹفک معلومات اور ایجادات میں اقوام عالم سے اسقدر پیچھے کیوں ہیں پورے طور پر حل ہوجاتا ہے۔ سائنٹفک انکشافات اور ایجادات کا انحصار ہے تجربہ اور مشاہدہ پر جب انسان مظاہر قدرت پر نظر ڈالتا ہے اور ان میں سے بعض کو دیکھکر جو اسکی سمجھ میں نہیں آتے اسکو استعجاب ہوتا ہے تو وہ اس استعجاب کو رفع کرنے کیلئے اس مظہر قدرت کی لم اور کنہ دریافت کرنیکی کوشش کرتا ہے اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اسکی معلومات میں اسکی کامیابی کی بقدر اضافہ ہوجاتا ہے اور یہی مظاہر قدرت کی لم اور کنہ دریافت کرنے کی کوشش سائنٹفک انکشافات اور ایجادات کا سنگ بنیاد ہے۔ مثلاً ہم فضائے آسمانی میں بجلی کی چمک دیکھتے ہیں اور رعد کی کڑک سنتے ہیں ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بجلی کی روشنی ہم تک رعد کی گرج سے بہت پہلے پہنچ جاتی ہے اس مشاہدہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ روشنی آواز سے بہت

زیادہ سریع السیر ہے۔ اسی طرح یہ بجلی کی چمک اور رعد کی کڑک ہمارے دل میں ایک استعجابی کیفیت پیدا کرتی ہے کہ فضائے آسمانی میں سوائے چند بادلوں کے ٹکڑوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آخر یہ روشنی اور آواز کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کوشش اور تلاش میں ہم ذیل کے نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

کہ بادلوں میں قوت کہربائیہ موجبہ پائی جاتی ہے اور زمین میں قوت کہربائیہ سالبہ موجود ہے جو بادل زمین سے نزدیک تر ہوتا ہے اسمیں کبھی کبھی زمین کی قوت کہربائیہ سالبہ سرایت کر جاتی ہے۔ اس بادل کے اوپر جب ایسے بادل گذرتے ہیں جن میں قوت کہربائیہ موجبہ موجود ہے تو یہ دونوں بادل ایک دوسرے کی قوت کہربائیہ کو اپنے میں جذب کرنا چاہتے ہیں اسی کشش سے ایک حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس حرارت سے دونوں بادلوں کے حجم کے مطابق ایک شعلہ اٹھتا ہے اسی شعلہ یا چمک کا نام بجلی یا برق ہے اور شعلہ یا صاعقہ کے ہوا میں سرایت کرنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسکا نام گرج یا رعد ہے۔

سائنٹفک محقق اسی تحقیق اور انکشاف پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ اسکی کوشش کرتا ہے کہ جو کیفیات فضائے آسمانی میں برق اور رعد کے وجود میں لانے کا باعث ہوتی ہیں وہی کیفیات وہ اپنے اسکول۔ کالج یا مدرسہ کے عمل گاہ میں بھی پیدا کرے۔ اور جب وہ اس میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اسکے عمل گاہ میں اسی طرح کی بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے اور رعد کی کڑک سنائی دیتی ہے جیسی کہ ہم فضائے آسمانی میں دیکھتے اور سنتے ہیں اور اسی عمل کا نام بجلی کی قوت کی ایجاد ہے جس سے آجکل دنیا کے اسقدر کام لئے جاتے ہیں۔

لہذا جو طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم ہم کو کبھی تجربہ اور مشاہدہ کا موقع نہ دے۔ اور

سب ایسے علوم کی تعلیم جن میں تجربہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہو اپنے درس سے خارج کردے وہ ہمارے ذہن کو اسکے ایک معمولی مگر بہت ضروری عمل سے معطل رکھکر ہمارے ذہن کی قوت مشاہدہ کو ساقط نہیں تو کم از کم بیکار ضرور کر دیتا ہے کہا جاتا ہے کہ علوم عقلیہ میں سے ریاضی ایسا علم ہے کہ جس سے انسانی ذہن کو سب سے زیادہ جلا ہوتی ہے اور جس میں ذہن کو سب سے زیادہ اپنا فطری فعل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہمارے عربی مدارس کا نصاب تعلیم ریاضی کی طرف سے بے توجہی کرکے ہم کو اس ذہنی جلا اور ورزش سے بھی محروم رکھتا ہے۔ جغرافیہ کے ذریعہ سے ہم کو اکناف عالم کا علم ہوتا ہے اور تاریخ کے ذریعہ سے ماضی وحال کے وقائع عالم کا۔ ہم ان علوم کی معلومات سے بھی محروم رکھے جاتے ہیں۔ معاشیات۔ اقتصادیات یا سیاسیات سے ہم کو بحث نہیں ہوتی۔ دنیاوی علوم کا جہانتک تعلق ہے ہم ہر قسم کی معلومات سے محروم رکھے جاتے ہیں اگر کوئی چیز دنیاوی علوم میں سے ہم کو پڑھائی جاتی ہے تو وہ صرف منطق اور فلسفہ قدیم میں بھی غالبًا وہ جو الہیات سے تعلق رکھتے ہیں گویا کہ ہم دنیا ومافیہا سے بالکل بے خبر رہ کر ہر وقت یا تو فلکیات کی سیر میں مصروف رہتے ہیں۔ اور یا تصور یا تصدیق کی بھول بھلیوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ جب پچھلے دو سو تین سو برس سے ہماری تعلیم کی یہ حالت رہی ہو تو کیا کوئی جائے تعجب ہے کہ ہمارے ذہنوں پر جمود کی حالت طاری ہو جاوے۔ اور ہم ہر قسم کی عقلی ترقی میں اقوام عالم سے پیچھے رہ جائیں۔

جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا اس سے ناظرین کرام پر عربی مدارس کے نصاب تعلیم کا ناقص ہونا پورے طور پر واضح ہو گیا ہوگا اور نیز یہ بھی محقق ہو گیا ہوگا کہ اس نصاب

میں فوری ترمیم کی ضرورت ہے۔ میری اطلاع ہے کہ خود علماء کرام کو موجودہ نصاب تعلیم کے ناقص ہونے کا احساس عرصہ سے ہو چکا ہے اور وہ خود بھی اسکی ترمیم کے خواہشمند ہیں۔ مگر یہ خواہش ترمیم فعل میں تبدیل ہونے کو نہیں آتی۔ اسی طرح مجھکو معلوم ہوا ہے کہ مولانا مولوی حسین احمد صاحب مدرس اول مدرسہ عالیہ دیوبند عرصہ سے موجودہ نصاب تعلیم کے ناقص ہونیکو محسوس کرتے ہیں اور عرصہ ۳۰ سال کا ہوا جب انھوں نے ایک نیا نصاب تعلیم عربی مدارس کیلئے تجویز فرمایا تھا مگر افسوس دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل و عقد مولانا کی تجویز کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے نہ معلوم ہمارے علماء سے عمل کا مادہ کیوں اسقدر ساقط ہو گیا درانحالیکہ جن کے وہ جانشین ہیں وہ تو سراپا عمل تھے۔ بہرحال عربی مدارس کے نصاب کی ترمیم کا مسئلہ اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اب وہ بہت زیادہ عرصہ کے لئے تذبذب کی حالت میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ عربی مدارس کا اعتبار اس وقت بھی عوام کی نگاہ میں بہت کچھ اٹھ چکا ہے۔ اگر عربی مدارس کی منتظمہ مجالس کے اراکین شوریٰ اور عربی مدارس کے دیگر بہی خواہ چاہتے ہیں کہ عربی مدارس کا وجود باقی رہے اور نیز یہ کہ عربی مدارس دراصل مسلمانوں کیلئے مفید تعلیم کا ذریعہ بنیں تو ضروری ہے اور اشد ضروری ہے کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں جلد سے جلد ضروری ترمیم فرما دیں۔ اب مجھ کو اور کچھ عربی مدارس کے نصاب تعلیم کے مسئلہ کی بابت عرض کرنا نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اگر علماء کرام کو اور عربی مدارس کے دیگر ارباب حل و عقد کو اس کا احساس ہو چکا ہے کہ ان مدارس کا نصاب تعلیم ناقص ہے نیز یہ کہ وہ اپنے یہاں کے طلاب کو مفید معلومات سے محروم رکھتا ہے۔ اور غیر ضروری اور بیکار علوم پڑھا کر ان کی تضییع اوقات کا باعث

ہوتا ہے اور باوجود اس علم اور احساس کے وہ نصاب مذکور میں ضروری ترمیم کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ عند اللہ مؤاخذہ دار ہوں گے اور مؤاخذہ دار بھی حق اللہ کی بابت نہیں بلکہ حق العباد کی بابت جو کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔

قسط پنجم

عمومی تعلیم کا فقدان

(۲) دوسری بڑی وجہ مسلمانوں کے سائنٹفک معلومات سے نابلد رہنے کی مسلمانوں میں عمومی تعلیم کا فقدان ہے۔

ہمارے عربی مدارس کی تعلیم جیسی کچھ بھی رہی ہو اس سے محض ایک بہت محدود گروہ مستفید ہوا کیا۔ اس نے عمومی تعلیم کی حیثیت کبھی حاصل نہیں کی وہ کاشتکاروں دستکاروں پیشہ وروں میں کبھی نہیں پھیلی۔ ہمارے دیہات اسکی آبیاری سے ہمیشہ محروم رہے ہمارے اہل حرفہ کو اسکے فیض سے مستفید ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا۔

کم از کم ۸۰ - ۸۵ فیصدی آبادی ہندوستان کی دیہات میں رہتی ہے۔ اور کاشتکاری پیشہ کو یا کاشتکاری سے متعلق جو پیشے ہیں مثل نجاری یا آہنگری کے کرتی ہے مسلمانوں کی دیہاتی آبادی کی شہری آبادی سے قریب قریب یہی نسبت ہے مسلمانوں کی اس دیہاتی آبادی کے دینی یا دنیاوی تعلیم کا کبھی کوئی منظم نظام نہیں ہوا۔

عربی مدارس کے علاوہ مسلمانوں کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیم کے دوسرے ادارے مکاتب تھے لیکن اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ مکاتب شہروں اور قصبات (جہاں زیادہ تر شرفا رہتے تھے) تک محدود تھے۔ یہ مکاتب بھی دیہات تک غالباً

کبھی نہیں پھیلے۔ یا جیسے چین یا افغانستان اور علاقہ سرحدی میں ابتک دستور ہے کہ ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب بھی ہوتا ہے یہ رواج بھی ہندوستان میں رائج نہیں تھا۔ لہذا ہمارے دیہاتی بھائیوں کو کبھی اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ اپنے قلوب کو انوار شرعیہ سے منور اپنے اخلاق کو احکام شرعیہ سے درست اور اپنے دماغوں کو حقائق عالم کے علم سے روشن کرسکیں۔ ہمارے دیہاتی بھائیوں میں سے بہت سے تو مسلم تھے اسلام لانے سے پیشتر جو اوہام پرستی ان میں رائج تھی اسکا بھی کبھی ہم نے کلی طور پر ازالہ نہیں کیا شارع اسلام نے کچھ مناسک شرعیہ ایسے قائم فرمائے ہیں کہ جن کے ذریعہ سے ہر کلمہ گو کی مسلسل اصلاح ہوتی رہے۔ ان مناسک میں سے سب سے اہم اور سب سے ضروری منسک نماز پنجگانہ ہے جسکے صفت میں خداوند عالم اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے ان الصّلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی مگر کونسی صلوٰۃ ہم کو ان فحش اور منکر باتوں سے بچاتی ہے۔ وہ صلوٰۃ جسمیں بندہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے مولا کے سامنے کھڑا ہے۔ اور اگر بندہ خود اپنے مولا کو نہیں دیکھتا تو کم از کم یہ محسوس کرتا ہے کہ اسکا مولیٰ اسکو دیکھ رہا ہے۔ وہ صلوٰۃ جسمیں بندہ اپنے مولا سے عرض معروض کرتا ہے اسکے سامنے گریہ وزاری کرتا ہے اسکے سامنے حالت قیام میں ہر رکعت میں عرض کرتا ہے۔

ایّاک نعبد و ایّاک نستعین ۝ اھدنا الصراط المستقیم ۝ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضّالین ۝ اور جب یہ عرض سچے دل سے ہر نماز میں متعدد مرتبہ کیجاتی ہے اور یہ عمل کم از کم دن میں پانچ مرتبہ کیا جاتا ہے تو کبھی نہ کبھی بندہ کی یہ دعا درجۂ اجابت ضرور حاصل کرتی ہے وہ نماز جسمیں بندہ جب رکوع اور سجدہ میں جاتا ہے

تو اپنے عجز کے اظہار کے ساتھ اپنے مالک کی سچے دل سے تسبیح و تحمید کرتا ہے ہم نے اپنی اجتہادی غلطی سے اپنے دیہاتی بھائیوں کو نماز کے ان عدیم المثال فوائد سے بھی محروم کر دیا ہے جب ہمارا ایک جاہل دیہاتی بھائی جو عربی زبان سے بالکل ناواقف ہے نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور الحمد شریف پڑھتا ہے اور ایاک نعبد و ایاک نستعین الخ تلاوت کرتا ہے تو یہ تلاوت اسکے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی نہ اس تلاوت کے وقت اس کے ذہن میں اپنے مالک سے کسی قسم کی عرض معروض کرنے کی کیفیت ہوتی ہے نہ جب وہ کہتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین ○ الرحمن الرحیم ط تو صفات خداوندی کا کوئی نقشہ اسکے ذہن میں کھنچتا ہے۔ اسی طرح جب وہ حالت رکوع و سجود میں سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتا ہے تو اسکے ذہن میں تسبیح و تحمید کی کوئی کیفیت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نماز میں کلام پاک کی کوئی آیت جسمیں اوامر و نواہی شرعیہ مذکور ہیں تلاوت کرتا ہے تو یہ تلاوت بھی اسکے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسلئے ایسی نماز اُسکے لئے کیا روحانی یا اخلاقی اصلاح کر سکتی ہے۔ اسی طرح جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے ساتھ خطبہ دینا اور سُننا فرض ہے۔ جمعہ کی نمازوں میں کم اور عیدین کی نمازوں میں کثرت سے ہمارے دیہاتی بھائی کس شوق سے قصبات اور شہروں کی مساجد میں فریضۂ جمعہ اور نماز عیدین ادا کرنے آتے ہیں۔ اور جمعہ کی نماز سے پہلے لازماً اور عیدین کی نماز کے بعد سب نہیں تو بہت سے ضرور خطبہ سنتے ہیں۔ مگر چونکہ خطبہ ایسی زبان میں ہوتا ہے جسکا ایک لفظ بھی وہ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے اس خطبہ سے نہ ان کی معلومات میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ ان کے

اخلاق کی کوئی اصلاح ہوتی ہے۔ اسلئے اگر میں یہ کہوں کہ خطیب کا خطبہ جملہ ان سامعین کے لئے جو عربی سے نابلد ہیں ایک فعل عبث کا حکم رکھتا ہے تو ضرور علماء کی طرف سے مورد عتاب بنوں گا۔

المختصر ہم نے خود اپنے دیہاتی بھائیوں کی دینی یا دنیاوی تعلیم اور روحانی یا اخلاقی اصلاح کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ برخلاف اسکے شارع اسلام نے جو پنجگانہ فریضہ نماز کے ذریعہ سے کافۃ المسلمین میں اسلامی روح پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا انتظام کیا تھا۔ اسکو اپنی اس اجتہادی غلطی سے کہ فریضہ نماز کا عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اداکرنا اور جمعہ اور عیدین کا خطبہ کسی عجمی زبان میں دیا جانا ناجائز ہے کالعدم کردیا۔ اگر میری معلومات غلطی نہیں کرتی ہے تو یہ واقعہ ہے کہ امام اعظم یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ساڑھے بارہ سو برس پہلے یہ فتویٰ دیا تھا کہ نماز کا کسی عجمی زبان میں پڑھنا جائز ہے۔ امام صاحب موصوف حدود عراق کے رہنے والے تھے اس وجہ سے امام صاحب کو ایران وغیرہ کے عجمی نومسلموں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ اسلئے جناب صاحب موصوف نے عجمی زبان میں نماز کے پڑھے جانے کی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسا فتویٰ دیا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام صاحب کے ہمعصر تھے۔ مگر وہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے اسلئے انکو عجمی نومسلموں سے واسطہ کم پڑتا تھا۔ اسلئے ان کو کسی ایسے فتوے کے صادر فرمانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ورنہ غالباً ان کا بھی وہی فتویٰ ہوتا جو امام صاحب کا تھا۔

کہا جاوے گا کہ کیا ضرور ہے کہ نماز یا جمعہ وعیدین کے خطبہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی اصلاح کیجاوے کیا ایسی اصلاح وعظ کے ذریعہ سے نہیں

ہوسکتی۔ اسکے جواب میں اول تو یہ عرض ہے کہ کیا علماء کرام نے یا ہم مسلمانوں نے ابتک کوئی منظم طریقہ اپنے دیہاتی بھائیوں تک وعظ کے ذریعہ سے احکام شرعیہ یا دوسری دینی یا دنیاوی معلومات پہنچانے کا جاری کیا ہے؟ جزوی اور فروعی مسائل کی بحثیں تو ہم ضرور اسلامی رسائل کے کالموں میں دیکھتے اور علماء کے مناظروں میں سنتے ہیں جو رسائل معدودے چند شہری یا قصباتی ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچتے ہیں اور جن مناظروں کے سامعین بھی شہری اور قصباتی آبادی کے معدودے چند افراد تک محدود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ علماء کے وفود دیہات میں ہمارے دیہاتی بھائیوں کی ترقی و اصلاح کے لئے دیہات کا بھی دورہ کرتے ہوں اور دیہات میں وہ اعلاء کلمۃ اللہ کی کوئی خدمت انجام دیتے ہوں یا دیہاتیوں کے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہوں۔ یہ مانا کہ ہم وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے ایک حد تک اپنے دیہاتی بھائیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ تاہم ہمارے یہ مواعظ حسنہ محض گاہے گاہے ہمارے دیہاتی اور شہری بھائیوں کے کانوں تک پہنچ سکتے ہیں اور یہ بھی اسوقت جب ہم کو اس بات کی توفیق ہو کہ ہم بہت بڑے پیمانہ پر ایسے مواعظ کا انتظام کریں جو انتظام اسوقت مفقود ہے۔ ہماری پنجگانہ نماز اور ہفتہ وار نماز جمعہ اور سال میں دو بار نماز عیدین کی جو ہمارے اوپر فرض ہیں کیسے قائم مقامی کر سکتے ہیں اور جو ہماری روحانی ترقی اور اخلاقی اصلاح ان فرائض نماز کو سمجھکر ادا کرنے سے ہوتی وہ ان مواعظ سے کیسے ہوسکتی ہے۔

بہرحال مواعظ حسنہ سے نماز کے بغیر سمجھے بوجھے پڑھنے کی کچھ تلافی اگر ہوسکتی ہے تو اسی صورت میں کہ ہم ان مواعظ حسنہ کو بھی اپنے اوپر پنجگانہ اسی طرح فرض و

لازم قرار دے لیں جیسے کہ نماز فرض و واجب ہے۔ جو صورت اول تو ناممکن الوقوع ہے اور لو فرضاً اگر ممکن الوقوع بھی ہو تو ہمارے علماء اُس کو ضرور بدعت قرار دیں گے اور بجا طور پر بدعت قرار دیں گے۔

مستورات کی تعلیم

یہ تو تھی کیفیت جماعت المسلمین میں مردوں کی تعلیم کی تھی۔ مستورات کی تعلیم کی حالت اس سے کہیں زیادہ ابتر رہی اور اب تک ہے۔ مستورات کی تعلیم کا کسی منظم طریقہ پر انتظام نہ شاہی زمانہ میں ہوا نہ اب ہے۔ شاہی زمانے کے مروجہ عربی مدارس اور مکاتب سے مستورات کا طبقہ بالکل مستفید نہیں ہو سکتا تھا نہ اب ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ گذشتہ زمانہ میں بڑے بڑے لوگ شہروں اور قصبات میں اپنے گھروں پر استانیاں رکھکر اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ محلہ کی لڑکیاں بھی ان استانیوں سے پڑھنے آجاتی تھیں۔ یہ اُستانیاں کلام پاک کی ناظرہ تعلیم دیتی تھیں اور دو چار کتابیں مثل راہ نجات وغیرہ کے پڑھاتی تھیں۔ لڑکیوں کیلئے شریف گھرانوں میں لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اپنی وسعت میں بے حد محدود تھی اور وہ بھی بہت ہی محدود طبقہ کے لئے۔ اعلے طبقہ سے اتر کر نیچے طبقہ کی مستورات اور دیہات کی قریباً کل مستورات حرف شناس بھی نہیں ہوتی تھیں اور جہل اور اوہام پرستی میں تب بھی مبتلا تھیں اور اب بھی مبتلا ہیں ایسی حالت میں کیسے امید کیجا سکتی تھی کہ ہماری قوم کے بچے اپنے گھروں میں اپنی ماؤں کی آغوش میں اچھی سے اچھی تربیت حاصل کر سکیں۔

کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہماری قوم کے بچے کوئی اچھا اخلاقی سبق اپنے گھروں سے لیکر نہیں نکلتے۔ ہماری مائیں نہ علوم دین سے واقف

ہوتی ہیں نہ علوم دنیا سے اسلئے اپنے بچوں کو نہ دین سکھا سکتی ہیں نہ دنیا۔
جب بچّہ چھوٹا ہوتا ہے تو اس کو بیجا اور ہوّے سے ڈرایا جاتا ہے اور اس طرح اسمیں ابتدا ہی سے بزدلی کا مادہ پیدا کیا جاتا ہے۔ جب وہ کچھ بڑا ہوتا ہے اور کچھ ضدیں کرنے لگتا ہے اور ماں اُسکی ضدیں پوری نہیں کر سکتی تو بجائے اسکے کہ اس کی ضدوں کو سختی سے روکا جائے جھوٹ بول کر اُس کو بہلایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح اسی وقت سے بچّے کے ذہن میں جھوٹ بولنے کا بیج بویا جاتا ہے۔ اسی طرح بچّہ اپنے ماں باپ بہن بھائی میں کوئی خاص اخلاقی خوبی نہیں پاتا بلکہ بہت سی اخلاقی کمزوریاں دیکھتا ہے۔ لہٰذا اسمیں بھی وہی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ نقشہ تو ایک حد تک اعلیٰ طبقوں کا ہے۔ عوام اور ادنیٰ طبقہ کے گھروں کی اس سے بھی کہیں ابتر حالت تھی۔ اور ہے ایسے گھروں میں تو بچّہ سوائے تو تڑاخ اور گالی گلوج کے بہت کم اور کچھ سنتا ہے۔ اور یہی سب باتیں بچہ سیکھتا ہے۔ کیا علماء نے قوم کی ماؤں کی دینی یا دنیاوی تعلیم کا کوئی انتظام کیا تھا یا اب کر رہے ہیں تاکہ قوم کے بچے برگزیدہ اخلاق لیکر گھروں سے نکلتے یا آئندہ نکلیں۔ جہاں تک میرا علم ہے علماء نے تو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام نہ پہلے کیا تھا نہ اب کر رہے ہیں۔ مگر عام مسلمانوں نے کہیں کہیں بڑے بڑے شہروں میں مستورات کی تعلیم کا بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر حال میں کچھ انتظام کیا ہے اور کچھ لڑکیوں کے مدارس جاری کئے ہیں۔ کیا علماء کے نزدیک ان مدارس کے بانیین کا یہ عمل جائز ہے اگر جائز ہے تو عام طور پر اُس کے جواز کا اور محمود ہونے کا اعلان فرمادیں تاکہ مسلمانوں میں جو ابھی تک تعلیم نسواں کی طرف سے شکوک ہیں رفع ہو جاویں۔ لیکن اگر علماء کے

نزدیک مسلمانوں کا یہ عمل نامحمود اور ناجائز ہے تو علماء نے اگر خود کوئی تجویز مستورات کی دینی یا دنیاوی تعلیم کے لئے سوچی ہو تو وہ پبلک (عوام) کے سامنے پیش کریں اور عوام کو اس کے قبول کی طرف دعوت دیں۔

یہ ہے مسلمانوں کی عمومی تعلیم کا پچھلی دو تین صدی کا خاکہ جس سے ناظرین پر واضح ہوا ہوگا کہ تعلیم یافتہ لوگ تو درکنار ہم مسلمانوں میں حرف شناس لوگوں کی تعداد بھی پانچ یا دس فیصدی سے زیادہ نہیں رہی۔ دیہاتی آبادی ہر قسم کی تعلیم سے خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی بالکل معرا رہی۔ شہری اور قصباتی آبادی کو عربی مدارس کے ذریعہ سے کچھ تعلیم ملی مگر وہ بھی اس قسم کی کہ اپنے متعلمین میں مشاہدہ اور تحقیق کا مادہ پیدا کرنے سے عاری ہو۔ جب ہماری عمومی تعلیم کی یہ حالت ہو تو کیا کوئی تعجب کی بات ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اپنے میں سے محقق اور موجد فن نہیں پیدا کر سکے۔ اگر کسی قوم نے عمومی تعلیم کی طرف سے اسقدر بے اعتنائی برتی ہو کہ اس کے افراد میں ۵ یا ۱۰ فیصدی سے زائد افراد حرف شناس بھی نہ ہوں وہ اختراع اور ایجاد کے دائرہ میں ایسی قوم یا قوموں کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے جسمیں تعلیمیافتہ افراد کی تعداد ۸۰ اور ۹۰ فیصدی تک پہنچتی ہو جن کی تعلیم ایسے علوم سے تعلق رکھتی ہو جو زیادہ تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہوں۔

ہم مسلمانوں کا ناقص طریقہ تعلیم کچھ ہندوستان ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ خالص اسلامی ممالک بھی اُس کے برے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ ان ممالک میں بھی پچھلی دو تین صدی کے اندر عربی مدارس کا طریقہ تعلیم قریب قریب انہی غلط اصولوں پر مبنی رہا جن پر ہندوستان کے مدارس کا۔ بلکہ بعض امور میں اسلامی

ممالک ہندوستان سے آزادی رائے اور وسعت نظر میں پیچھے رہے ۔مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کے دیگر برگزیدہ بزرگوں نے سالہا سال ہوئے کہ کلام پاک کا اردو اور فارسی ترجمہ کرنا جائز ہی نہیں قرار دیا۔ بلکہ اپنی رائے کو عملی جامہ پہنا کر اور قرآن پاک کا اردو اور فارسی میں ترجمہ فرما کر ہندوستان کے موجودہ زمانے کے علماء کو اس جھگڑے سے بچا لیا کہ کلام پاک کا کسی عجمی زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔ برخلاف اس کے مصر میں یہ مسئلہ اب تک حل نہیں ہوا ہے بلکہ مصر میں آج کل قرآن پاک کے ترجمہ پر بڑے جھگڑے برپا ہیں۔ ایک فریق اسکو ناجائز کہتا ہے دوسرا اس کو واجب بتاتا ہے اس پر فریقین کی طرف سے رسائل اور مضامین لکھے جا رہے ہیں اِس واقعہ سے میری اس توجیہ کی جو میں نے امام اعظمؒ کے فتوے جواز ادائیگی فریضہ نماز بزبان عجمی کے کی تھی تائید ہوتی ہے ۔ہندوستان میں علماء کرام کو بوجہ اس کے کہ ہندوستان میں عربی زبانداں معدودے چند افراد تک محدود تھی ۔کلام پاک کے اردو اور فارسی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ علمائے ایسا ترجمہ کرنا صرف جائز ہی نہیں قرار دیا ۔بلکہ اپنے فتوے کو عمل کا جامہ بھی پہنا دیا۔ چنانچہ ہندوستان میں یہ مسئلہ کہ آیا قرآن پاک کا ترجمہ کیا جانا چاہیئے یا نہیں مختلف فیہ نہیں رہا ۔مصر میں چونکہ چاروں طرف عربی ہی عربی عوام کی مادری زبان ہے اسلئے کلام پاک کے ترجمہ کرنیکے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ ابتک زیر بحث رہا ۔ اور ہے ۔کاش علمائے کرام ایسے معاملات میں اپنی قوت اجتہاد زیادہ مستعدی بے خوفی اور آزادی سے کام میں لاتے تو جو جمود کی کیفیت آج عالم اسلامی پر طاری ہے وہ نہ ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے

مصر میں جب سے شیخ مصطفےٰ مراغی نے جامع ازہر کی عنان مشیخت اپنے ہاتھ میں لی
ہے۔ وہاں بہت سی اصلاحات عمل میں آئی ہیں۔ مگر پچھلی دو تین صدی کے
اندر جامع ازہر کی تعلیم بھی ہندوستان کے عربی مدارس کی تعلیم سے بہت زیادہ مختلف
نہیں تھی جامع ازہر اور مغرب اقصیٰ کے عربی مدارس میں کوئی شعبہ سائنٹفک تحقیقات
کا نہ تھا اور نہ ایسے علوم پڑھائے جاتے تھے جو تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہوں نہ غالبًا
عمومی تعلیم کا کوئی انتظام تھا۔ مصر اور مغرب اقصیٰ کے تمام ممالک یورپین ممالک
سے ہر قسم کی سائنٹفک تحقیقات اور ایجادات میں پیچھے رہ گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ
ہمارے دیکھتے دیکھتے ان سب ممالک پر یکے بعد دیگرے یورپین اقوام کا تسلط
ہو گیا۔ حال میں مجھکو اقصائے مغرب کے ایک سفرنامہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔
یہ سفرنامہ کچھ پرانا نہیں ہے بلکہ ۱۹۳۰-۳۱ء کا ہے فاضل مصنف نے جس کاوش سے
ایک ایک تاریخی مقام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور سلاطین علماء اور اکابر کے مزارات
تلاش کئے وہ خاص طور پر قابل داد ہے۔ نیز فاضل مصنف نے مغرب کی آبادی
کے موجودہ تمدنی کیفیت اور یہاں کے مسلمانوں کے تمدنی سیاسی اور معاشرتی حالات
کا نقشہ بھی تفصیل سے کھینچا ہے جو اپنی جگہ کچھ کم عبرت آموز نہیں (دیکھو معارف
بابت اگست ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۵۷-۱۵۶)۔

یہ بات واقعات حاضرہ کے مطالعہ کرنے والوں کو پہلے سے بھی معلوم تھی اس
سفرنامہ سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے کہ مغرب اقصیٰ کے کل ممالک اسپین
اور فرانس کے زیر اقتدار کس طرح آئے باوجود اس کے کہ اہل مراکو (مغرب اقصیٰ
کے عرب اور بربر) اب بھی جرأت و ہمت مردانگی اور شجاعت میں اسپانی اور

فرانسیسی تو کیا یورپ کی کسی قوم سے فروتر نہیں ہیں اب بھی اسپانی قوم کے نمائندے باوجود اس کے کہ وہ مراکش میں بحیثیت حاکم اور فاتح کے ہیں مقامی عربوں اور بربر قوم کے افراد سے خائف رہتے ہیں چنانچہ اپنے سفرنامہ کے صفحہ ۲۰ پر سبتہ کے حال میں مصنف موصوف تحریر فرماتے ہیں "نصرانی آبادی ہر وقت ہتھیار بند رہتی ہے باوجودیکہ عربی آبادی نہتی ہے اور کسی عرب کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں۔ لیکن پھر بھی مسلح اسپانی باشندہ اسقدر خائف و لرزاں رہتا ہے کہ کسی معمولی مسکین عرب نے بھی تیوری چڑھا کر دیکھا اور اس کے ہوش وحواس غائب ہو گئے۔ عربی شوق جہاد و عشق شہادت کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی بات پر عرب مارنے اور مرنے کو آمادہ ہو جاتا ہے... اور یہی وجہ ہے کہ ہر اسپانی باہر نکلتے وقت ہتھیار لے کر باہر نکلتا ہے۔ دیکھو "سفرنامہ اقصائے مغرب" مرتبہ میر دبیر الحاج قاضی ولی محمد صاحب بھوپال سول سروس"۔

اخبار بین حضرات کو یاد ہو گا کہ ابھی بہت زمانہ نہیں ہوا کہ ریف میں غازی عبدالکریم اور اس کے ساتھ کے مجاہدین نے باوجود اپنی بے سروسامانی کے اسپانیہ کو اس کے حلقۂ اثر میں متعدد شکستیں دی تھیں اور اسپانیہ اس وقت تک ان عرب مجاہدین کا کسی قسم کا اندفاع نہیں کر سکا جب تک کہ فرانس اسپانیہ کی مدد کو اپنا لشکر نہیں لایا۔ مزید براں اس وقت جو اسپین میں عرصہ سات آٹھ ماہ سے بڑے پیمانہ پر خانہ جنگی جاری ہے۔ اور باغی اقوام میں جو بسرکردگی جنرل فرنکو لڑ رہے ہیں اور جن کا پلہ "گورنمنٹ" افواج کے مقابلے میں ابتک بھاری رہا ہے بڑا حصہ اہل مغرب یا مراکش کے عربوں کا ہے اور جنرل فرانکو کی کامیابیاں انھیں عربوں

کی مرہون منّت ہیں۔ یہ کیفیت تو مراکش کے عربوں کی اُس حالت کی ہے جب وہ مجبور و مقہور
اور اغیار کے پنجہ استبداد میں گرفتار رہیں گذشتہ زمانہ میں تو ان عربوں کی شجاعت و بسالت
کا سکہ سارا یورپ مانے ہوئے تھا۔ ملک اندلس سے خارج البلد ہونیکے بعد بھی یورپ
کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا جسکے جہاز مراکش کے ساحل کی طرف سے گذرتے ہوئے
خائف نہ ہوتے ہوں اور یورپ کی بڑی بڑی قوتوں کو اسی مراکش کے میدانوں میں کسی نہ
کسی معرکہ میں عربوں کے ہاتھ سے شکست فاش نہ ہوئی ہو۔ جب مراکش کے عرب شجاعت و
بسالت محنت و جفاکشی میں اقوام یورپ میں کسی سے کم تر نہیں اور ان صفات میں
بعض اقوام یورپ سے ضرور برتر و افضل ہیں تو کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ پچھلی نصف
صدی کے دوران میں اسپین اور فرانس ان پر بتدریج مستولی ہو جاویں۔ یہ استعجاب
کی کیفیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی نصف صدی کے دوران میں
یوروپین اقوام کا یہ تسلط محض مغرب اقصےٰ تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ ساری
شمالی افریقہ تک پھیل گیا۔ الجیریا ٹیونس طرابلس (ٹرپولی) مصر کوئی ملک
بھی اس مغربی اثر سے محفوظ نہ رہ سکا اور یکے بعد دیگرے اپنی آزادی
کھو بیٹھا (اگرچہ شکر کا مقام ہے کہ حال میں مصر نے اپنی کھوئی ہوئی
آزادی پھر حاصل کر لی ہے۔ اور حکومت مصر اور سلطنت برطانیہ میں
بذریعہ معاہدہ باہمی دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے ہیں)۔ اور حال میں شمالی افریقہ
سے گذر کر ملک حبش تک پہنچ گیا جبکہ اٹلی نے ملک حبش (Abyssinia)
کی آزادی کا ایک سات آٹھ ماہ کی جنگ میں خاتمہ کر دیا۔ اگرچہ اہل حبش
بھی جوانمردی اور شجاعت میں اٹلی والوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں

یہ واضح رہے کہ (Abyssinia) ایک عیسائی سلطنت تھی۔ مگر اہل حبش کا عیسائی ہونا ان کو اہل یورپ کی دست وبرد سے نہیں بچا سکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان شمالی افریقہ کی تمام اقوام یکے بعد دیگرے مغلوب ہوجا ئینگی وجہ مشترک کیا تھی تو وہ وجہ مشترک سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ۱۹ صدی کے دوران اور بیسویں صدی کے آغاز میں اہل یورپ برابر سائنٹفک معلومات میں ترقی پر ترقی کرتے رہے اور ان معلومات کے ذریعہ سے نت نئی ایجادات یورپ میں ہوتی رہیں۔ جن کی وجہ سے اہل فرنگ نے تجارت و فلاحت میں وہ ترقی کی کہ افریقہ تو کیا دنیا کے بڑے حصہ کی تجارت ان کے ہاتھ میں آگئی اور ان کی ہمسایہ قومیں اپنی بیشتر ضروریات کے لئے ان کی دست نگر بن گئیں جس کی وجہ سے ان قوموں کی اقتصادی حالت بگڑ گئی۔ اور انھیں سائنٹفک معلومات کے ذریعہ سے فنون جنگ اور آلات حرب میں وہ ترقی کی کہ انکے پرانے حریف یعنی اہل مغرب اس قابل نہیں رہے کہ ان کے مقابلے میں اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں۔ کیونکہ جہاں تک سائنٹفک معلومات کا تعلق ہے اہل مغرب اور دیگر اسلامی ممالک کے باشندے اس دوران میں جہاں تھے وہیں رہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کا مقابلہ سائنس سے اور علم کا علم سے ہوسکتا ہے۔ علم کا مقابلہ جہل۔ اور توپ و تفنگ کا مقابلہ تیر و کمان سے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے بے جوڑ مقابلے کا نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا یعنی شمالی افریقہ کی سب قومیں خواہ وہ طرابلس اور مراکش کے عرب اور

بر بر ہوں ۔ خواہ سوڈان اور ابی سینیا کے حبشی ہوں اپنے سے بہتر مسلح قوموں کے سامنے باوجود اپنی بے بدل شجاعت و بہادری کے مفتوح و مجبور ہوئیں شمالی افریقہ اور یورپ کے درمیان بحر روم جو دیگر سمندروں کی نسبت سے بہت ہی غیر وسیع ہے واقع ہے اور جس کی وسعت بعض بعض مقامات پر پندرہ بیس میل سے زائد نہیں ہے ۔ جیساکہ درمیان طنجہ (جو مراکش کے شمال مغربی کونے پر جبل طارق کے مقابلہ میں واقع ہے) جبل طارق شہر طنجہ بحیرہ روم اور بحر اطلانتک کے سنگم پر واقع ہے ۔ اس کے اور اندلس کے درمیان بحر زقاق کی پتلی دہار واقع ہے کہ جس کا عرض کسی جگہ دس اور کسی جگہ بیس میل ہے دیکھو سفرنامہ "اقصائے مغرب" یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس پتلے سے سمندر یعنی بحر روم کے اُتر کی آبادی کیوں ہر قسم کی سائنس و علم و حکمت سے آراستہ و پیراستہ ہے اور اس کے دکھن کی آبادی ان سب سے معرا ہے

بہ بیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

کیا اُتر میں کسی ایک خدا کی خدائی ہے اور دکھن میں کسی دوسرے خدا کی اگر تفاوت کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو دونوں ممالک کے طریقہ تعلیم کا فرق ۔ ایک جگہ کا طریقہ تعلیم تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ سے علمی اور سائنٹفک انکشافات کی طرف سے ہماری رہبری کرتا ہے ۔ اور دوسری جگہ کا طریقہ تعلیم ایسے علوم و فنون کو جو تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہوں ہمارے نصاب سے خارج کرکے ہم کو ان علمی انکشافات کا موقع ہی نہیں دیتا ۔

امید ہے کہ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ اس سے ناظرین کرام پر بخوبی
طور پر واضح ہو گیا ہو گا کہ آج کل تنازع للبقا کی جو جنگ ساری دنیا میں
جاری ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی قوم اپنے کو فنا سے نہیں بچا سکتی
جب تک کہ وہ قوم علم و حکمت اور سائنٹفک معلومات میں دیگر اقوام کے دوش
بدوش نہ چل سکے۔ اور چونکہ ہم مسلمان سائنٹفک معلومات میں دیگر اقوام عالم سے
بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے سائنٹفک تعلیم پر زور دینے کی اور
بھی زیادہ ضرورت ہے۔ ناظرین کرام اور علمائے ذوی الاحترام میرے استدلال
سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن جو کچھ واقعات اوپر عرض کئے گئے اگر ان کی بنا پر یہ
ہمارے رہبران دین اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ سائنس اور علوم جدیدہ کی ناواقفیت
کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچا اور اب بھی پہنچ
رہا ہے۔ اور آئندہ بھی پہنچنے کا قوی خطرہ ہے تو مجھ کو قوی امید ہے کہ
ہمارے بزرگان دین اپنی زبردست آواز مسلمانوں میں سائنس کی ترویج
کے لئے بلند فرما دیں گے۔ اور ایسا کرنے کے لئے اگر عربی مدارس کے نصاب تعلیم
کی ترمیم کی ضرورت ہو گی تو بلا کسی مزید پس و پیش کے اس میں ضروری ترمیمات فرمائینگے۔
اگر میں اپنے مندرجہ بالا معروضات کے ذریعہ سے علماء کے گروہ میں تھوڑا
سا احساس بھی اس بات کا پیدا کر سکوں کہ ہم مسلمانوں کو ہماری سائنس اور
علوم جدیدہ کی عدم واقفیت کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے۔ اور آئندہ
بھی پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور یہ کہ علما کا اس وقت تک جو سائنس اور علوم
جدیدہ کی طرف سے نقطہ نظر رہا اس میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے تو میں سمجھوں گا

کہ میں اپنی سعی میں گو وہ کیسی ہی حقیر ہو بڑی حد تک کامیاب ہو گیا۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللہ ؁۔

نوٹ: ۔ علماء میں سے جن حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ پیش کیا جائے اگر وہ بزرگ **اپنی قیمتی رائے** سے اس مسئلہ کے متعلق جس سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے خواہ وہ رائے موافق ہو یا مخالف راقم الحروف کو مطلع فرمائیں گے تو خاص طور پر باعث مشکوری ہو گا۔

محمد ذکاء اللہ خاں

۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء

طابع و ناشر لطیفی پریس، دہلی